الرسالہ

Al-Risāla

August 1998 • No. 261 • Rs. 9

صحیح رخ پر محنت اور مسلسل محنت ——

یہی اس دنیا میں کامیابی کا واحد راز ہے۔

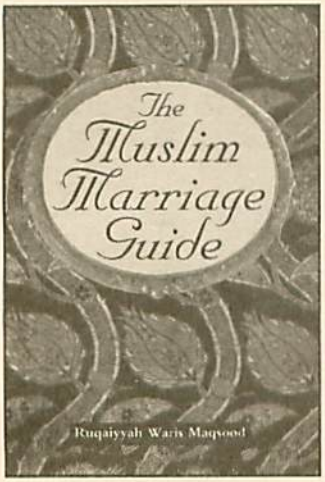

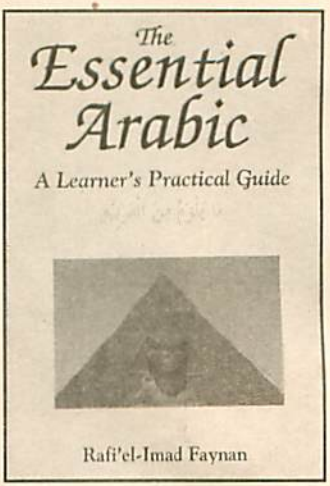

Muslim Marriage Guide

By Ruqaiyyah Waris Maqsood

Islam teaches that marriage is 'half of religion'. Because it fulfils so many basic needs of individuals and of society, it is the cornerstone upon which the whole Muslim life is built.

Modern life brings strains and pressures which can upset even the most compatible relationship. This means that nowadays, to protect the spirit of cooperation and happiness which is the sign of the true Islamic marriage, careful thought needs to be given to the mechanisms which help husband and wife to live together and respect each other's rights.

This highly-readable book takes the reader through the relevant passages in the Quran and Hadith, and goes on to discuss the main social and emotional problems that can afflict relationships, suggesting many practical ways in which these can be resolved.

ISBN 81-85063-25-7 Pages 192, Price Rs. 250

The Essential Arabic

A Learner's Practical Guide

By Rafi'el-Imad Faynan

This practical guide to modern Arabic is presented in a very simple and easy-to-grasp style. Unique in its approach, it explains the language by analyzing sample sentences in the kind of crystal clear manner which leaves a lasting impression on the reader's mind. The step-by-step approach of this easy-to-use guide will be found useful not only for beginners, but also for more advanced students. It can also be a handy tool for teachers of the language. One is finally left wondering how the hitherto dreaded learning of Arabic could have been made so delightfully simple...

ISBN 81-85063-26-5 Pages 184, Price Rs. 200

بسم اللہ الرحمن الرحیم

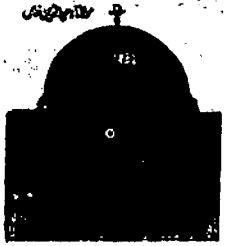

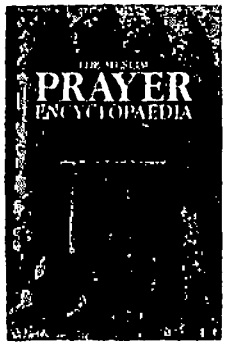

الرسالہ
Al-Risāla

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

Al-Risāla
1, Nizamuddin West Market, Near DVB Office,
New Delhi-110013
Tel. 4611128, 4611131 Fax 4697333, 4647980
e-mail: risala.islamic@axcess.net.in
website: http://www.alrisala.org

SUBSCRIPTION RATES
Single copy Rs. 9
One year Rs. 100. Two years Rs. 195
Three years Rs. 290. Five years Rs. 480
Abroad: One year $ 20/£10 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY
IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577
e-mail: info@ipci-tv.co.uk

DISTRIBUTED IN USA BY
AL-RISALA FORUM INTERNATIONAL
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel./Fax 718-2583435
e-mail: caleem@juno.com

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of The Islamic Centre, New Delhi. Printed at Nice Printing Press, Delhi.

تجرباتِ سفر

راقم الحروف نے غالباً سب سے پہلا سفرنامہ پچاس سال پہلے لکھا تھا۔ یہ جنوبی ہند کا سفرنامہ تھا۔ یہ سفرنامہ شائع نہ ہوسکا۔ اب اس کی کوئی کاپی میرے پاس موجود نہیں البتہ اس کا ایک جزء اب تک مجھے یاد ہے۔ سفر کے دوران ایک ریلوے اسٹیشن پر ہماری ٹرین رکی میں نے دیکھا کہ پلیٹ فارم پر ایک کیلے والا آیا اور "بڑم بڑم" کہہ کر اس کو بیچنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے کیلے چھوٹے چھوٹے بظاہر معمولی قسم کے ہیں۔ میں نے اپنے دل میں سوچا کہ یہ کیلے یہاں کون خریدے گا۔

مگر میں نے دیکھا کہ وہ اس قسم کے کسی احساس سے بے نیاز ہوکر اپنے کیلے بیچنے کے لیے پلیٹ فارم پر چکر لگا رہا ہے تھوڑی دیر کے بعد وہ میرے سامنے سے دوبارہ گزرا تو میں نے دیکھا کہ اس کے بیشتر کیلے فروخت ہو چکے تھے۔ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے میں نے اپنے سفرنامہ میں لکھا تھا کہ —— اس دنیا میں ہر چیز کے خریدار موجود ہیں، شرط یہ ہے کہ آدمی اپنا سودا لے کر دنیا کے بازار میں کھڑا ہو جائے۔

میرا پہلا مطبوعہ سفرنامہ غالباً وہ ہے جو تقریباً چالیس سال پہلے رامپور کے ماہنامہ الحسنات (جلد ۲۶ شمارہ ۸) میں چھپا تھا: اس کا عنوان تھا —— بمبئی کے سفر میں۔ اِس مطبوعہ سفرنامہ کا ایک جزء یہاں نقل کیا جاتا ہے:

میں بمبئی کے ریلوے اسٹیشن پر مغل سرائے جانے والی ٹرین کا انتظار کر رہا ہوں۔ بمبئی بہت بڑا جنکشن ہے۔ ہر وقت گاڑیاں چلتی رہتی ہیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد میرے سامنے سے ٹرینیں گزر رہی تھیں۔ میں نے سوچا کہ مغل سرائے ایکسپریس کے علاوہ اگر میں کسی اور گاڑی پر سوار ہو جاؤں تو کیا وہ مجھے منزل مقصود تک پہنچا دے گی؟ دوسری جو گاڑیاں ہیں ان کی حیثیت بھی تو بہر حال گاڑی کی ہے۔ ان پر بھی بہت سے آدمی سوار ہیں۔ ان میں ایسی بھی ہیں جو مغل سرائے اکسپرس سے زیادہ تیز دوڑتی ہیں اور ایسی بھی ہیں جن میں خوب کشادہ جگہ مل سکتی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی بھی مجھے اپنی منزل تک نہیں پہنچا سکتی۔ بلکہ اگر ان میں سے کسی پر میں بیٹھ جاؤں تو وہ مجھ کو منزل مقصود سے اور زیادہ دور کر دے گی۔ سیکڑوں میل کا یہ ٹکٹ دوسرے راستہ پر مجھ کو ایک میل بھی نہیں لے جا سکتا۔ اگر یہ ٹکٹ لے کر میں دوسرے راستے کی گاڑی پر بیٹھ جاؤں تو نہ صرف یہ کہ مجھے اس کا الگ سے کرایہ دینا ہوگا بلکہ جرمانہ بھی ادا کرنا پڑے گا۔

اسی طرح دنیا میں زندگی کی بہت سی راہیں ہیں ہر راہ پر بے شمار آدمی چل رہے ہیں۔ ہر ایک کے خطوط مقرر ہیں اور ہر ایک پر چلنے کے لیے مخصوص آسانیاں مہیا کی گئی ہیں۔ مگر ان بے شمار راستوں کے درمیان صرف ایک ہی صراط مستقیم ہے جو آدمی کو اس کی صحیح منزل کی طرف لے جاتی ہے۔ آدمی اگر صراط مستقیم کا ارادہ کرکے کسی اور راہ پر چل پڑے یا کسی راہ میں آدمیوں کی بھیڑ دیکھ کر اس کو اختیار کرلے کہ جب اتنے سارے آدمی اس پر جا رہے ہیں تو ضرور یہ کوئی صحیح راہ ہوگی۔ تو کیا ان تمام صورتوں میں وہ منزل پر اسی طرح لازماً پہنچ جائے گا جس طرح اصل راہ کو اختیار کرنے کی صورت میں وہ پہنچتا۔ اگر دنیا میں ہر چلتی ہوئی گاڑی وہیں نہیں جاتی جہاں آدمی کو جانا ہے تو آخرت کی منزل کے متعلق کیوں لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بہر حال آجائے گی چاہے ہم کسی بھی طرف دوڑ رہے ہوں۔

سفر غیر مرغوب

سفر میرے مزاج کے بالکل خلاف ہے۔ ایک سفر کے دوران ایک عرب عالم سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا تھا کہ "انا رجل یحب العزلۃ" میں ایک تنہائی پسند آدمی ہوں مگر حالات کے تحت مجھے بار بار سفر کرنا پڑا۔ ملک کے اندر بھی اور ملک کے باہر بھی، خشکی میں بھی اور سمندر میں بھی۔ بوقت تحریر (فروری ۱۹۹۸) میرے ہوائی سفروں کی تعداد تقریباً سوا سو ہو چکی ہے۔ ٹرین وغیرہ کے ذریعہ جو اسفار ہوئے ان کی تعداد اس کی دگنا سے بھی زیادہ ہوگی۔ میرا حال یہ ہے کہ ہر سفر مجبوری کے تحت کرتا ہوں اور جب واپس آتا ہوں تو اس احساس کے ساتھ کہ آئندہ میں کبھی سفر نہیں کروں گا۔ اس کے باوجود مشن کا تقاضا دوبارہ نئے سفر کے لیے مجبور کر دیتا ہے۔

فروری ۱۹۹۸ میں میرا ایک سفر امریکہ کے لیے ہوا۔ وہاں واشنگٹن میں ۶ - ۷ فروری کو ایک سیمنار تھا۔ اس کے بعد وہاں ایک اور کانفرنس ۲۱ مارچ ۱۹۹۸ کو ہونے والی تھی۔ لوگوں نے بہت زیادہ اصرار کیا کہ میں امریکہ میں مزید ٹھہروں اور ۲۱ مارچ کی کانفرنس میں شرکت کے بعد ہندستان واپس جاؤں۔ مگر ہر قسم کی سہولت کے باوجود میں سفر سے اتنا زیادہ اکتایا ہوا تھا کہ زبردستی واپس چلا آیا۔

سفر امریکہ

واشنگٹن (ڈی سی) میں کچھ اہل علم امریکیوں نے ایک ادارہ قائم کیا ہے۔ جس کا نام نان وائلنس انٹرنیشنل ہے۔ اس کے صدر ایک نومسلم پروفیسر عبد الکریم کرو ہیں۔ اب تک اس کے دو اجلاس

ہو چکے ہیں۔ اس کا تیسرا سالانہ اجلاس ۶-۷ فروری ۱۹۹۸ کو واشنگٹن میں ہوا۔ اس کی دعوت پر راقم الحروف نے شرکت کی۔

۴ فروری کی رات کو دہلی سے روانگی ہوئی۔ اس سفر میں جناب حبیب محمد صاحب بھی میرے ساتھ تھے۔ پورے راستہ میں ان سے دینی اور علمی باتیں ہوتی رہیں۔ وہ الرسالہ کے مستقل قاری ہیں۔ انھوں نے کہا کہ "فکر اسلامی" کو میں نے تقریباً دس بار پڑھا ہے۔ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد میرے ذہن کے تمام گوشے کھل گئے اور اب میں کسی شک وشبہ کے بغیر الرسالہ مشن سے پورا اتفاق کرتا ہوں۔

میں نے کہا کہ جو لوگ الرسالہ مشن کی مخالفت کرتے ہیں، ان کی مخالفت کو میں بدنیتی پر محمول نہیں کرتا۔ یہ تمام لوگ دراصل غلط فہمی کا شکار ہیں۔ یہ سب کے سب لوگ اس عربی مقولہ کے مصداق ہیں کہ: الناس عداء ما جھلوا (لوگ اس چیز کے دشمن بن جاتے ہیں جس سے وہ بے خبر ہوں) یہ لوگ ایک خاص طرح کی باتیں سنتے اور پڑھتے رہے ہیں یہاں تک کہ ان کے اندر وہ چیز پیدا ہو گئی جس کو علمی زبان میں کنڈیشنڈ تھنکنگ کہا جاتا ہے۔ ایسے لوگ جب الرسالہ اور اس کی مطبوعات کو پڑھتے ہیں تو وہ ان کو نئی اور انوکھی معلوم ہوتی ہیں۔ ان کا حال وہ ہو جاتا ہے جس کو شاعر نے اپنے اس مشہور شعر میں بیان کیا ہے:

آئینِ نو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اڑنا منزل بہت کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

اصل یہ ہے کہ موجودہ زمانہ ہر اعتبار سے ایک نیا زمانہ ہے۔ اس زمانہ میں دنیا روایتی دور سے نکل کر سائنٹفک دور میں داخل ہوئی۔ اب ضرورت ہے کہ اسلام کے ابدی اصولوں کو جدید حالات پر ازسرِ نو منطبق کیا جائے۔ اسی ازسرِ نو انطباق کا شرعی نام اجتہاد ہے۔ "فکر اسلامی" میں اس کے مجتہدانہ اصول بتائے گئے ہیں اور الرسالہ مشن کی بقیہ کتابیں گویا اسی کا تفصیلی انطباق ہیں۔

طویل سفر

ہندستان سے امریکہ کے سفر میں آدمی کو کرۂ ارض کا نصف حصہ طے کرنا پڑتا ہے۔ یہ ایک طویل سفر ہے۔ ہم تقریباً بیس گھنٹہ راستہ میں گزارنے کے بعد ۵ فروری کو دوپہر بعد واشنگٹن (ڈی سی) پہنچے۔ ڈی سی کا مطلب ہے: ڈسٹرکٹ آف کولمبیا۔ یہاں کے لوگ اکثر واشنگٹن ڈی سی کو صرف ڈی سی کہتے ہیں۔

واشنگٹن ایرپورٹ سے ہوٹل تک پہنچنے کے لیے لمبا راستہ طے کرنا پڑا۔ اس طرح ہم نے پہلے ہی دن گویا شہر کے بیشتر حصہ کو دیکھ لیا۔ واشنگٹن پورے معنوں میں سپر پاور کی راجدھانی نظر آیا۔ ماسکو اگر

اونچی بلڈنگوں کا شہر ہے تو واشنگٹن خوب صورت اور پُرعظمت عمارتوں کا شہر۔ یہ ۱۷۹۵-۱۸۵۵ میں امریکہ کی راجدھانی بنا۔ اس کے بعد اس میں مسلسل ترقی ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ اپنی موجودہ پُر رونق حیثیت تک پہنچا۔

ایک تقابل

ڈاکٹر مبارک نے ۶ فروری کی صبح کو اپنی افتتاحی تقریر میں بتایا کہ نان وائلنس انٹرنیشنل کا موجودہ جلسہ پہلے دمشق میں کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ مگر وہاں کی حکومت نے اس کی اجازت نہیں دی۔ اس کے بعد وہ اسی مقصد کے لیے قاہرہ گئے مگر وہاں کی حکومت نے بھی قاہرہ میں اس کا جلسہ منعقد کرنے کی اجازت نہیں دی۔ آخر کار انھوں نے فیصلہ کیا کہ اس اجتماع کو واشنگٹن میں کریں۔ جب انھوں نے واشنگٹن میں امریکن یونی ورسٹی کے ذمہ داروں سے کہا تو انھوں نے نہ صرف اجازت دی بلکہ ہر قسم کا تعاون بھی دیا۔

انھوں نے کہا کہ امریکہ کو اسلام دشمن بتایا جاتا ہے مگر ہمارا تجربہ اس کے برعکس ہے۔ امریکہ میں ہم کو خود اسلام کے کام کے لیے جو مواقع حاصل ہیں وہ اس وقت مسلم ملکوں میں بھی موجود نہیں۔ حتی کہ بہت سے اسلامک گروپ اپنی سرگرمیوں کے لیے مسلم ملکوں میں موافق ماحول نہ پا سکے۔ چنانچہ اب وہ امریکہ آکر اپنی اسلامی سرگرمیوں کو جاری کیے ہوئے ہیں۔ میں نے ایک صاحب سے پوچھا کہ ایسا کیوں ہے کہ مسلم ملکوں میں اسلامی سرگرمیوں کے مواقع نہیں۔ انھوں نے کہا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان ملکوں میں شخصی نظام قائم ہے اور شخصی نظام ہر عوامی سرگرمی کو اپنے لیے خطرہ سمجھتا ہے، خواہ وہ اسلام کے نام پر کیوں نہ کی گئی ہو۔

اسلام اور امن

موجودہ زمانہ کا سب سے بڑا مسئلہ امن کا مسئلہ ہے۔ قدیم زمانہ میں جنگ ایک ایسے واقعہ کا نام تھا جو میدان جنگ میں دو فوجوں کے درمیان پیش آتا تھا۔ بقیہ آبادی سے اس کا کوئی براہ راست تعلق نہ تھا۔ مگر موجودہ زمانہ میں جدید ہتھیاروں کی ایجاد کے بعد جنگ عمومی تباہی کا ذریعہ بن چکی ہے۔ اب جنگ کے معنی ——— عام آبادی کی ہلاکت، اقتصادیات کی بربادی، پانی اور ہوا کا زہر آلود ہو جانا، زمین سے لے کر فضا تک ایسا فساد برپا ہونا کہ یہاں معتدل زندگی ہی انسان کے لیے ممکن نہ رہے۔

یہی وجہ ہے کہ آج کل ہر جگہ امن کے موضوع پر بحثیں جاری ہیں۔ اور بڑے بڑے اجتماعات

کیے جارہے ہیں۔ فروری ۱۹۹۸ میں مجھے تین انٹرنیشنل کانفرنسوں میں اسلام اینڈ نان وائلنس کے موضوع پر اظہار خیال کے لیے بلایا گیا۔ ایک ہندستان (وارد ھا) میں اور دو بیرون ملک رباط (مراکو) اور واشنگٹن (امریکہ) میں۔ میں ان میں سے صرف واشنگٹن جاسکا۔ اور وہاں امریکن یونی ورسٹی میں ہونے والے سیمنار (۶-۷ فروری) میں شرکت کی۔

اس موقع پر میں نے دو تقریریں کیں اور ڈسکشن میں حصہ لیا۔ ۶ فروری کی تقریر کا ایک جزء لوگوں کے لیے خصوصی اہمیت کا باعث بنا۔ اور اس کو ہینڈ بل کی صورت میں چھاپ کر بڑی تعداد میں تقسیم کیا گیا۔ تقریر کا وہ حصہ یہ تھا ——— یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ اسلام اور تشدد ایک دوسرے کا ضد ہیں۔ اسلامی تشدد کا تصور اس قدر واضح طور پر بے بنیاد ہے کہ وہ بلا بحث ہی قابل رد ہے۔ یہی واقعہ کہ تشدد موجودہ زمانہ میں قابل بقاء نہیں، یہ یقین کرنے کے لیے کافی ہے کہ تشدد ایک اصول کے طور پر اسلام کے نقشہ میں بالکل اجنبی ہے۔ اسلام ایک ابدی مذہب ہے، اور ایک ابدی مذہب اپنے نظام میں ایک ایسے اصول کا تحمل نہیں کرسکتا جو انسانی تاریخ کے بعد کے زمانوں میں قابل عمل نہ رہے۔ تشدد کو اسلام کے ساتھ جوڑنے کی کوئی کوشش اسلام کی ابدیت ہی کو مشتبہ قرار دینے کے ہم معنی ہے۔

ایک تقریر میں میں نے کہا کہ ——— نان وائلنس (عدم تشدد) کا مطلب ہے وائلنس (تشدد) کے اسباب کے باوجود نان وائلنس (عدم تشدد) کی روش پر قائم رہنا۔ یہی صبر کی حقیقت بھی ہے۔ نان وائلنس اپنی حقیقت کے اعتبار سے عین وہی چیز ہے جس کو قرآن میں صبر کہا گیا ہے۔

صبر دراصل مثبت ردعمل کا دوسرا نام ہے۔ ناخوش گوار حالات میں منفی ردعمل سے اپنے آپ کو بچانا اور یک طرفہ طور پر اپنے آپ کو مثبت ردعمل پر قائم رکھنا، یہی صبر ہے۔ چونکہ اس اخلاقی روش پر قائم ہونے کے لیے برداشت کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے اس کو شریعت میں صبر کا نام دیا گیا۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ صبر کرنے والوں کو بلا حساب اجر دیا جائے گا (الزمر ۱۰) دوسری آیتوں اور حدیثوں کو ملا کر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس لامحدود اجر کا تعلق دنیا سے بھی ہے اور آخرت سے بھی۔ دنیا میں جو لوگ اپنے معاملات کو صبر کے اصول پر چلائیں وہ یہاں غیر معمولی کامیابی حاصل کریں گے۔ اسی طرح جو لوگ صبر و برداشت کی قیمت دیتے ہوئے خدا کے دین کو اختیار کریں وہ آخرت میں خدا کے غیر معمولی انعامات کے مستحق قرار دیے جائیں گے۔

Islam and Peace

It is no exaggeration to say that Islam and violence are contradictory to each other. The concept of Islamic violence is so obviously unfounded that *prima facie* it stands rejected. The fact that violence is not sustainable in the present world is enough to believe that violence as a principle is quite alien to the scheme of things in Islam. Islam claims to be an eternal religion and an eternal religion cannot afford a principle in its scheme which was not sustainable in the latter periods of human history. Any attempt to bracket violence with Islam amounts to making the very eternity of Islamic religion doubtful.

—Maulana Wahiduddin Khan
Feb. 6, 1998
Speech delivered at the symposium on Islam and Peace sponsored by Non-violence International and The Mohammed Said Farsi Chair of Islamic Peace at the American University - Washington D.C.

امن اور انصاف

سیمنار میں جو مقالے پیش کیے گئے، میرے نقطۂ نظر سے وہ زیادہ واضح نہ تھے۔ امن کے سوال پر موجودہ زمانہ کے مسلم ذہن صاف نہیں ہیں۔ اس کا اظہار اکثر مقالات اور تقریروں میں بھی ہوا۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر سہیل ہاشمی کا مقالہ:

جو لوگ عدل کے سوال کو الگ رکھ کر امن قائم کرنا چاہتے ہیں ان کی تردید کرتے ہوئے مقالہ نگار نے کہا کہ میرے نزدیک اسلام کا نقطۂ نظر بنیادی طور پر اس سے مختلف ہے۔ امن اور نظم کے بارے میں قرآن کا نقطۂ نظر انصاف کے تصور پر قائم ہے۔ انصاف کے بغیر امن ممکن نہیں:

The Islamic approach is, I believe, fundamentally different. The Qur'an's approach to issues of peace and order is rooted in the notion of justice. Without justice there can never be peace.

میرے نزدیک یہ اسلام کی صحیح نمائندگی نہ تھی۔ اصل یہ ہے کہ دو حالتیں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں، اور دونوں کے لیے ایک دوسرے سے مختلف قوانین ہیں۔ ایک صورت وہ ہے جب کہ ایک حاکم کے ماتحت باشندوں میں بدامنی پیدا ہو۔ ایسی حالت میں حاکم کا فرض ہے کہ وہ اپنے ماتحت علاقے میں امن قائم کرنے کے لیے ہر ممکن تدبیر کرے۔ اور اگر ترغیب کے ذریعہ ممکن نہ ہو تو طاقت کو استعمال کرکے امن کو بحال کرے۔ اس کو عام طور پر لا اینڈ آرڈر کا مسئلہ کہا جاتا ہے اور لا اینڈ آرڈر کے معاملہ میں شریعت کا اصول بھی وہی ہے جو سیکولر نظام کا اصول ہے۔

دوسری صورت وہ ہے جب کہ دو آزاد فریقوں کے درمیان نزاع کی حالت برپا ہو جائے اور اس کی ضرورت پیش آجائے کہ دونوں فریقوں کے درمیان امن اور اعتدال کی فضا قائم کی جائے۔ اس دوسری صورت میں امن کے قیام کے لیے عدل کی شرط لگانا درست نہیں ہے۔ ایسی حالت میں ہمیشہ عدل کے سوال کو علٰحدہ رکھ کر امن قائم ہوتا ہے۔ ایسے معاملہ میں امن کے لیے عدل کی شرط لگانا صرف نزاع کو بڑھانا ہے۔ کیوں کہ وہ قابل عمل ہی نہیں۔

اسلام کے عہد اول میں جب کبھی اسلامی حکومت کے ماتحت علاقہ میں بدامنی کا مسئلہ پیدا ہوا تو وہاں بشرطِ ضرورت طاقت کا استعمال کیا گیا، لیکن دوسری صورت میں طاقت کا استعمال نہ ممکن تھا اور نہ کبھی ایسا کیا گیا۔ اس کی ایک نمایندہ مثال حدیبیہ کی صلح ہے۔ اس موقع پر معاملہ دو آزاد فریقوں

(مسلمان اور قریش) کے درمیان تھا۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کی شرطوں کو مان کر امن قائم کیا۔ اگرچہ یہ شرطیں انصاف کے اصول کے سراسر خلاف تھیں۔

جہاد کا معاملہ

شیخ جودت سعید (دمشق) مشہور عرب عالم ہیں۔ ان کی بہت سی کتابیں عربی زبان میں چھپ چکی ہیں۔ تشدد کے موضوع پر انھوں نے میرے خیالات سے مکمل اتفاق کیا۔ انھوں نے کہا کہ تشدد کے ذریعہ کبھی بھلائی نہیں آسکتی (ان العنف لا یأتی بالرشد) اور یہ کہ تشدد کے ذریعہ جو دین لایا جائے وہ دین نہیں (ان الدین الذی یأتی بالعنف لیس بدین)

انھوں نے کہا کہ جہاد کے مسئلہ پر میں نے چالیس سال تک غور اور مطالعہ کیا۔ میری قطعی رائے ہے کہ شرعی اعتبار سے جہاد (بمعنی قتال) متفرق افراد کا کام نہیں، بلکہ منظم امت کا کام ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ صرف ایک قائم شدہ حکومت ہی جہاد کا حق رکھتی ہے۔

میں نے کہا کہ آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔ چنانچہ فقہاء کا متفقہ قول ہے کہ الرجیل للامام۔ یعنی جنگ کا اعلان کرنا حاکم وقت کا کام ہے۔ اور وہ بھی اس وقت جب کہ جنگ کے دوسرے شرائط پورے ہو رہے ہوں۔ یہ بے حد اہم بات ہے۔ جنگ میں متحدہ کمان انتہائی طور پر ضروری ہے۔ اور متحدہ کمان صرف حکومت کے ماتحت جنگی کارروائی ہی میں ہو سکتی ہے۔ افراد اگر جنگ چھیڑیں تو اس کی کوئی ایک متحدہ کمان نہیں ہو سکتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ افراد کی چھیڑی ہوئی جنگ بہت جلد انارکی بن جائے گی۔ اور صورت حال کو مزید خراب کر کے عظیم تر تباہی کا باعث بنے گی۔

شیخ جودت سعید نے اپنا مقالہ عربی زبان میں پیش کیا۔ تاہم وہ انگریزی زبان بھی سمجھتے تھے چنانچہ میرے مقالہ اور تقریر کو انھوں نے بخوبی طور پر سمجھا۔ جس میں میں نے اسلامی جہاد کو متشددانہ عمل کے بجائے کامل طور پر ایک پر امن عمل کی حیثیت سے پیش کیا تھا۔ آخر میں ایک گفتگو کے دوران انھوں نے کہا: یا مولانا وحید الدین۔ انک طرحت فی اخر ورقتك موضوعاً خطیراً لم ینتبه الیه الناس۔ انت فتحت هذا الباب لهذا الموضوع الخطیر۔

ایک مثال

امریکہ میں ہر مسلم علاقے کے لوگ ہیں۔ اس لیے وہ تمام مسلم تحریکیں بھی وہاں کم و بیش پائی جاتی

ہیں جو امریکہ کے باہر مختلف ملکوں میں موجود ہیں۔ ان میں سے کئی تحریکوں کے کارکن مذکورہ سیمنار میں سرگرم نظر آئے۔ ایک مسلم حلقہ کے کارکن نے اپنا ماہنامہ مسیج (The Message) دیا۔ یہ نومبر ۱۹۹۷ کا شمارہ تھا۔ اس کی ایک رپورٹ کا عنوان تھا ——— امریکی مسلمان محاصرہ میں :

American Muslims under siege.

اس بھیانک عنوان کو دیکھ کر میں نے اس کو پڑھا تو معلوم ہوا کہ یہ مضمون ——— کھودا پہاڑ نکلی چوہیا کا مصداق ہے۔ اس مضمون کا خلاصہ یہ تھا کہ امریکہ کے جیل خانوں میں مسلمانوں کے اوپر زبردست ظلم کیا جاتا ہے۔ وہ ظلم یہ ہے کہ امریکہ میں جیل خانہ کے قیدیوں کے لیے ایک متعین کپڑا (پریزن یونیفارم) ہوتا ہے۔ کسی جیل میں بعض مسلم قیدیوں نے اپنی الگ شناخت قائم کرنے کے لیے داڑھی بڑھائی اور ٹوپی پہن لی۔ حکام نے کہا کہ یہ قواعد جیل کے خلاف ہے اس لیے آپ داڑھی اور ٹوپی کو چھوڑ کر یہاں کے مشترک یونیفارم کو استعمال کیجیے۔ مضمون نگار نے اس پر سخت احتجاج کرتے ہوئے لکھا ہے کہ امریکہ میں طاغوت اور کافر اور مشرک کی حکومت ہے۔ اس لیے یہاں کے مسلمانوں کو اپنا دین بچانے کے لیے اسلامی ملکوں میں چلا جانا چاہیے۔

مضمون نگار جو غالباً کوئی بلیک مسلم ہیں ان کو معلوم نہیں کہ امریکہ کی جیلوں میں تو صرف ڈریس کا مسئلہ ہے۔ مگر وہ ان مسلمانوں کو جن مسلم ملکوں میں بھیج رہے ہیں وہاں ان کو جسمانی تعذیب، ناقص غذا اور طرح طرح کی مشقت کا سامنا پیش آتا ہے۔

بدقسمتی سے اس قسم کی باتیں امریکہ کی تمام مسلم مسجدوں، مسلم اداروں اور یہاں کی نام نہاد مسلم میڈیا میں مسلسل دہرائی جاتی ہیں۔ میں نے امریکہ کے سات سفروں میں صرف ۲ آدمی ایسے پائے جو امریکی زندگی کے مثبت پہلوؤں کا ذکر کرتے تھے۔ بقیہ تمام لوگ کم و بیش امریکہ کی برائی کرتے ہوئے نظر آئے۔ مزید عجیب بات یہ ہے کہ میرے علم کے مطابق ان میں سے کوئی ایک شخص بھی طاغوتی امریکہ کو چھوڑ کر اپنے اسلامی ملک میں جانے کے لیے تیار نہیں۔

ملاقاتیں

واشنگٹن کے سیمنار (فروری ۱۹۹۸) میں مختلف ملکوں کے اسکالر اور پروفیسر شریک تھے۔ بہت سے لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ پروفیسر عبدالکریم کرو (ناظم سیمنار) مجھے بہت زیادہ سنجیدہ نظر آئے۔ وہ

امریکن یونی ورسٹی (واشنگٹن) میں استاد ہیں۔ انھوں نے یہ منصوبہ بنایا تھا کہ کانفرنس کے بعد میں مزید ایک ہفتہ واشنگٹن میں ٹھہروں۔ اس دوران یونی ورسٹی میں لکچر، امریکن ٹی وی میں انٹرویو، وغیرہ کا پروگرام ان کے پیش نظر تھا۔ مگر میں نے مزید قیام سے معذرت ظاہر کی۔ بعد کو خصوصی ملاقات میں انھوں نے کہا کہ کانفرنس کے لیے آپ کا پیپر بہت اہم تھا۔ اسلام اور نان وائلنس کے موضوع پر اتنے واضح خیالات ہم نے پہلی بار سنے۔

اس موقع پر دمشق (شام) کے شیخ جودت سعید بھی آئے تھے، وہ شام کے ممتاز علماء میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان سے تفصیلی تبادلۂ خیال کا موقع ملا۔

ان کی ایک کتاب کا نام حتی یغیروا ما بانفسھم ہے جو ۲۲۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے قرآن کی آیت (الرعد ۱۱) کی تشریح کی ہے۔ ان کے مطابق، اس آیت میں دو تبدیلیوں (تغییرین) کا ذکر ہے۔ ایک خدائی تبدیلی (تغییر اللہ) اور دوسری قومی تبدیلی (تغییر القوم)

میرے نزدیک یہ تشریح غیر واضح ہے۔ اس آیت میں دراصل قانون فطرت کا ذکر ہے یعنی کسی گروہ میں اجتماعی سطح کی تبدیلی اس وقت آتی ہے جب کہ اس میں انفرادی سطح کی تبدیلی آچکی ہو۔ قوم کے عروج یا ارتقار کا انحصار فرد کی حالت پر ہے۔ افراد کے بگاڑ سے قوم میں بگاڑ آتا ہے۔ اسی طرح کوئی قوم اس وقت اصلاح یافتہ ہوتی ہے جب کہ اس کے افراد اصلاح یافتہ ہو گئے ہوں۔ شیخ جودت سعید سے میں نے اس کتاب کا ذکر کیا تو انھوں نے کہا کہ یہ میری ابتدائی دور کی تصنیف ہے۔

ڈاکٹر محمود ایوب ایک لبنانی مسلمان ہیں۔ وہ امریکہ کی ایک یونی ورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ وہ نہایت سنجیدہ آدمی ہیں مگر لبنان کے بارے میں ان کی سوچ غالباً موضوعی سوچ نہیں۔ انھوں نے کہا کہ جب میں سنتا ہوں کہ لبنان میں اسرائیلی بمباروں نے فلاں مسلم بستی کو تباہ کر دیا تو میں اپنے آپ کو اسرائیل کے خلاف غصہ اور نفرت سے نہیں بچا پاتا۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ سوچ حقیقت پر مبنی نہیں۔ اس قسم کے لوگ کہانی کے صرف نصف آخر کو دیکھتے ہیں، وہ اس کے نصف اول کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ واقعات بتاتے ہیں کہ اسرائیل اور لبنان کا مسئلہ اس وقت پیدا ہوا جب کہ لبنان کے سرحدی علاقہ میں مسلم مجاہدوں نے اپنے اڈے بنائے اور وہاں سے اسرائیل کے خلاف متشددانہ کارروائی شروع کی۔ اس کا جواب اسرائیل نے مزید تشدد سے

دیا۔ اسرائیل کا جوابی تشدد دراصل مسلمانوں کے "جہاد" کی قیمت تھی۔ مسلمانوں کو یا تو اس قسم کا پرتشدد جہاد نہیں کرنا چاہیے۔ اور اگر وہ ایسا کرتے ہیں تو اس کے بعد انھیں کسی شکایت کے بغیر اس کی قیمت ادا کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

عجیب بات ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان ایک طرف اپنی متشددانہ کارروائیوں کو جہاد کہتے ہیں اور جب فریق ثانی ان پر جوابی تشدد کرتا ہے تو وہ اس کے خلاف شکایت کا طوفان کھڑا کرتے ہیں۔ حالانکہ مسلمانوں کی متشددانہ کارروائی اگر جہاد تھی تو انھیں اس کے نتیجہ کو احدی الحسنیین (التوبہ ۵۲) سمجھ کر بخوشی اس کو قبول کرنا چاہیے۔

فطری فارمولا

ایک صاحب سے امن اور عدل کے مسئلہ پر گفتگو ہوئی۔ ان کا خیال تھا کہ جب تک عدل قائم نہ کیا جائے امن قائم نہیں ہو سکتا۔ اس سلسلہ میں میں نے اپنے مقالہ میں جو بات کہی تھی اس پر تبصرہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ یہ بہت سادہ نقطۂ نظر ہے :

It is too simplistic approach

میں نے اس کی واقعاتی تشریح کے لیے کہا مگر وہ اپنے تبصرہ کی کوئی واقعاتی تشریح پیش نہ کر سکے۔ میں نے کہا کہ یہ سادہ اور غیر سادہ کی بات نہیں۔ قانون فطرت کے مطابق یہ ممکن ہی نہیں کہ عدل قائم کر کے امن حاصل کیا جائے۔ ایسا کبھی تاریخ میں نہیں ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ امن خود عدل نہیں ہے بلکہ امن سے وہ راستہ کھلتا ہے جس کے ذریعہ آپ عدل کی منزل تک پہنچ سکیں :

Peace, itself, is not justice. But peace does clear the path to justice.

مثال کے طور پر پیغمبر اسلام نے جب حدیبیہ کا امن معاہدہ کیا تو ایسا نہیں ہوا کہ خود معاہدہ کے ساتھ عین اسی وقت عدل کا قیام عمل میں آگیا ہو۔ بلکہ جو ہوا وہ یہ تھا کہ اس امن معاہدہ نے وہ مواقع اور امکانات پیدا کیے جن کو استعمال کر کے آپ کے لیے عدل کا قیام ممکن ہو گیا۔

مشاہدات

امریکہ کے لیے میرا موجودہ سفر وہاں کا ساتواں سفر تھا۔ ان سفروں میں مجھے امریکہ کے مختلف پہلوؤں کو دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ وہاں کے شہر اور گاؤں، وہاں کے ادارہ اور لائبریریاں، وہاں کی سائنسی

اور صنعتی ترقیاں، وہاں کے انفرادی اور اجتماعی زندگی کے مظاہر، وہاں کی اقتصادی اور سیاسی پالیسیاں، وہاں کے اکثریتی اور اقلیتی گروہ، وغیرہ وغیرہ۔

اس بار کے سفر میں جو نئی چیزیں دیکھیں ان میں سے ایک واشنگٹن کا وہائٹ ہاوس تھا۔ وہائٹ ہاوس امریکی صدر کی سرکاری رہائش گاہ ہے۔ اسی میں اس کے دفاتر بھی قائم ہیں۔ یہ ایک تین منزلہ عمارت ہے جس میں ایک سو کمرے ہیں۔ اس عمارت کی ڈیزائن ۱۷۹۲ء میں تیار کی گئی اور اس کی تعمیر ۱۸۰۰ء میں مکمل ہوئی۔ سفید رنگ کی وجہ سے اس کا نام وہائٹ ہاوس پڑ گیا۔ اس عمارت کو برٹش فوجیوں نے اپنے حملے کے دوران ۱۸۱۴ء میں جلا دیا تھا اس کے بعد اس کو دوبارہ تعمیر کیا گیا۔ دوسری تعمیر میں توسیع کر کے اس کو زیادہ بڑا بنا دیا گیا۔

۱۰ فروری کو جب کہ میں وہائٹ ہاؤس کی اس تاریخی عمارت کو دیکھ رہا تھا تو میں نے سوچا کہ اس سے پہلے امریکیوں اور انگریزوں کے درمیان سخت لڑائی ہوئی۔ یہاں تک کہ انگریزوں نے وہائٹ ہاوس کو جلا دیا۔ مگر آج دونوں ملکوں کے درمیان کامل دوستی ہے۔ بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ امریکہ کے باہر اس کا سب سے بڑا دوست ملک برطانیہ ہے۔ اس کے برعکس مثال برصغیر ہند میں ملتی ہے۔ یہاں انڈیا اور پاکستان کے درمیان ٹکراؤ پیش آیا مگر وہ دونوں ملکوں کے درمیان ابدی نفرت میں تبدیل ہو گیا۔

اس فرق کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ امریکہ اور برطانیہ کی جنگ محدود طور پر دو فوجوں کی باہمی جنگ تھی۔ یہ جنگ فوج سے شروع ہوئی اور فوج ہی پر ختم ہو گئی۔ اس کے بعد وہاں ایسا نہیں ہوا کہ دونوں ملکوں کا میڈیا مسلسل طور پر ایک دوسرے کے خلاف نفرت کی لفظی فصل اگانا شروع کر دے۔

انڈیا اور پاکستان میں اس کے برعکس معاملہ پیش آیا۔ یہاں یہ ہوا کہ جب مسلح فوجوں کا کام ختم ہوا تو زبان و قلم کے لفظی مجاہدین نے اس کی جگہ لے لی۔ ان رہنماؤں اور دانشوروں نے یہ کیا کہ وہ اپنے لکھنے اور بولنے کی پوری طاقت اور میڈیا کے تمام وسائل ایک دوسرے کے خلاف نفرت کی باتیں پھیلانے میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ اس طرح یہاں معاملہ دو فوجوں کے وقتی ٹکراؤ پر ختم نہیں ہوا بلکہ وہ وسیع ہو کر دونوں ملکوں کے عوام تک پہنچ گیا۔ یہ معاملہ یہاں تک بڑھا کہ ہندستانی قومیت کا معیار پاکستان سے نفرت بن گیا اور پاکستانی قومیت کا معیار ہندستان سے نفرت۔ اس نفرت کے بغیر اب نہ کسی ہندستانی کی قومیت مکمل ہوتی اور نہ کسی پاکستانی کی قومیت کامل سمجھی جاتی۔

توسیعی معاشرہ

امریکہ میں مجھے ایک صاحب کے یہاں کچھ وقت گزارنے کا موقع ملا۔ میں نے دیکھا کہ ان کے یہاں ہر چند منٹ کے بعد ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے اور وہ بہت دل چسپی کے ساتھ ہر کال کا جواب دیتے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ آپ کے یہاں اتنا زیادہ ٹیلی فون آتے ہیں ان میں جاب یا کاروبار سے متعلق کتنے ٹیلی فون ہوتے ہیں اور دوستوں اور رشتہ داروں کے کتنے ٹیلی فون۔ انھوں نے کہا کہ کام سے متعلق تو ایک پرسنٹ ہوتا ہوگا۔ ۹۹ فیصد ٹیلی فون دوستوں اور رشتہ داروں کے ہوتے ہیں۔

یہی اکثر ان لوگوں کا حال ہے جو باہر کے ملکوں سے آکر یہاں آباد ہوئے ہیں۔ یہ لوگ ابھی تک اصل امریکی معاشرے کا جزء نہیں بنے۔ وہ یہاں تقریباً اجنبی کے انداز میں رہتے ہیں۔ امریکی سماج سے ان کا تعلق محدود طور پر صرف جاب یا کاروبار کے دائرہ میں ہوتا ہے۔ یہاں وہ لوگ اپنے آپ کو مقامی سوسائٹی سے کٹا ہوا پاتے ہیں۔ ٹیلی فون (یا ماڈرن کیمونی کیشن) ان کے لیے گویا اس کی ایک تلافی ہے۔ امریکی معاشرہ میں بظاہر منقطع ہونے کے باوجود وہ اپنے ان لوگوں کے ساتھ مربوط رہتے ہیں جو نہ صرف امریکہ میں بلکہ دوسرے مقامات پر آباد ہیں۔ وہ عملاً محدود ہونے کے باوجود ایک توسیعی معاشرہ سے مسلسل جڑے ہوئے رہتے ہیں۔

اس تجربہ کے بعد میں نے سوچا کہ جو لوگ اسلام کا کام کرنے کے لیے "جماعت" کو ضروری قرار دیتے ہیں وہ ایک خلافِ زمانہ بولی بول رہے ہیں۔ یہ قدیم زمانہ کی بات ہے جب کہ کسی کام کو کرنے کے لیے جماعتی ڈھانچہ ضروری ہوتا تھا۔ اب ماڈرن کیمونی کیشن (ڈاک، ٹیلیفون، فیکس، انٹرنٹ، وغیرہ) گویا جماعت کی حسن تلافی ہے۔ اب ایک شخص کو کوئی بڑا کام کرنے کے لیے جماعتی ڈھانچہ بنانے کی ضرورت نہیں۔ وہ ایک مقام پر بیٹھ کر ساری دنیا سے مربوط ہو سکتا ہے۔ وہ محدود جماعت بنائے بغیر زیادہ بڑے پیمانہ پر ایک عالمی جماعت کی سربراہی کر سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قدیم طرز کی جماعت بندی اب صرف مشرقی دنیا کے غیر ترقی یافتہ ملکوں ہی میں پائی جاتی ہے۔ امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں اب ایسے گروپ وجود میں آچکے ہیں جو رسمی تنظیم بنائے بغیر اس کیمونی کیشن کے ذریعہ ایک توسیعی حلقہ قائم کیے ہوئے ہیں۔ اور وہ فائدے زیادہ بڑے پیمانہ پر حاصل کر رہے ہیں جو جماعت یا تنظیم سے متعلق سمجھے جاتے تھے۔

امریکہ میں بسنے والے مسلمانوں نے ابھی تک ماڈرن کمیونی کیشن کا صرف یہی ایک فائدہ جانا ہے کہ اس کے ذریعہ سے وہ اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کا ایک وسیع تر معاشرہ بنا سکیں۔ ان کو شاید نہیں معلوم کہ اس کی ایک اور برتر صورت بھی ہے۔ اور وہ ہے دعوتِ اسلام کے لیے جدید ذرائع کا استعمال۔ اگر یہاں کے مسلمانوں میں یہ دوسرا شعور پیدا ہو جائے تو وہ امریکہ میں ایک نیا "اسلامی معاشرہ" بنا سکتے ہیں۔ ایک ایسا معاشرہ جس میں وہ یہاں کے اصل باشندوں سے مربوط ہو جائیں۔ جدید کمیونی کیشن کے ذریعہ وہ یہاں ایک وسیع تر اسلامی دنیا بنا سکیں۔

ایک کیسٹ

یہاں ایک بار میں ایک صاحب (مسٹر فاروق چشتی) کے ساتھ ان کی کار میں سفر کر رہا تھا۔ انھوں نے کار میں لگے ہوئے ٹیپ ریکارڈر میں ایک آڈیو کیسٹ لگایا۔ اس کے بعد ایک پاکستانی رہنما کی تقریر آنے لگی۔ اس تقریر میں یہ بتایا گیا تھا کہ مسلمان کا اصل مشن یہ ہے کہ وہ دنیا کے ہر دوسرے نظام کو توڑ کر اسلام کا نظام خلافت قائم کریں یہ ان کے لیے فرض عین ہے۔ کسی غیر اسلامی نظام سے ہم آہنگ ہو کر زندگی گزارنا ان کے لیے جائز نہیں۔

انھوں نے کہا کہ اس سلسلہ میں حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی میں یہ مثال ملتی ہے کہ انھوں نے ایک غیر مسلم بادشاہ کی سلطنت کے ماتحت ایک حکومتی عہدہ قبول کیا۔ مگر آپ کی یہ روش امت محمدیؐ کے لیے نمونہ نہیں۔ ہمارے لیے صرف محمد رسول اللہ کا اسوہ ہی واحد قابل اتباع نمونہ ہے جیسا کہ قرآن میں آیا ہے: لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ (الاحزاب ۲۱)

میں نے کہا کہ یہ استدلال بالکل غلط ہے۔ استدلال کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ دوسری متعلق آیتوں کو سامنے رکھ کر مفہوم متعین کیا جائے نہ کہ صرف ایک آیت کو لے کر اس پر تقریر شروع کر دی جائے۔ میں نے کہا کہ قرآن میں ایک اور مقام پر دوسرے نبیوں (بشمول یوسفؑ) کا ذکر ہے اور اس کے بعد پیغمبر اسلام کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ ——— یہ ہیں وہ لوگ جن کو اللہ نے ہدایت دی، پس تم بھی ان کے طریقہ پر چلو (الانعام ۹۱) اس آیت کے مطابق واضح طور پر حضرت یوسفؑ بھی ہمارے لیے قابل اتباع ہیں جس طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔

میں نے کہا کہ یہ ایک غیر علمی استدلال ہے۔ موجودہ زمانہ میں تقریباً تمام مسلم رہنما اور دانشور

اسی فکری غلطی میں مبتلا ہیں وہ علمی طرز فکر سے آشنا نہیں اس لیے وہ ایسی باتیں کہتے ہیں، جو اہل علم کی نظر میں کوئی قیمت نہ رکھتی ہوں۔

الرسالہ مشن

یہ اللہ کا فضل ہے کہ امریکہ کے کچھ لوگوں کے تعاون سے الرسالہ مشن اب انٹرنٹ پر آگیا ہے، اور مزید اس کو ویب سائٹ پر لانے کی کوششیں جاری ہیں۔ اس میں دو صاحبان کا خاص حصہ ہے۔ جناب خواجہ کلیم الدین صاحب اور فاروق چشتی صاحب۔ خواجہ کلیم الدین صاحب اسی وقت سے میرے ساتھ ہو گئے تھے جب کہ میں واشنگٹن ایرپورٹ پر اترا۔ فاروق چشتی صاحب ٹرین سے سفر کرکے ۶ فروری کی شام کو واشنگٹن پہنچے۔ وہ کمپیوٹر کے اکسپرٹ ہیں۔

ایک مجلس میں میں نے کہا کہ فاروق صاحب کی فنی مہارت اور کلیم الدین صاحب کا اخلاص اکٹھا ہوا تو اتنا بڑا کام ہوا کہ الرسالہ مشن قدیم عہد سے نکل کر جدید عہد میں داخل ہو گیا۔

صحیح آغاز

امریکہ کے سفر میں جو سبق آموز چیزیں میں نے دریافت کیں ان میں سے ایک یہ تھا کہ امریکہ کی ترقی کا راز کیا ہے۔ نادان لوگ امریکہ کی ترقی کا راز مفروضہ سازشوں میں تلاش کر رہے ہیں مگر یہ توجیہہ لغویت کی حد تک بے اصل ہے۔ امریکہ کی ترقی کا راز اس کی دو سو سالہ تعمیری جدوجہد ہے۔ یہ اس کے حقیقی عمل کا نتیجہ ہے نہ کہ کسی قسم کی سازش کا نتیجہ۔

اس موضوع پر میں نے بہت سے امریکیوں سے گفتگو کی اور مطبوعہ ریکارڈ میں بھی اس کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کی۔ میری دریافت کے مطابق امریکہ کی امتیازی ترقی کا راز یہ ہے کہ اس کو اپنی زندگی کے آغاز میں ایسے لیڈر اور رہنما ملے جنھوں نے اس کو صحیح اور قابل عمل رہنمائی دی۔

موجودہ دنیا میں کسی قوم کی حقیقی ترقی بے عمل کے بعد ہوتی ہے، ایسا عمل جو کئی جنریشن تک جاری رہے۔ امریکہ کی خوش قسمتی یہ ہے کہ اس کو اپنی جدوجہد کے آغاز میں ایسے لیڈر ملے جنھوں نے اس کو ایسا پروگرام دیا جو موجودہ اسباب کی دنیا میں قابل بقا (sustainable) تھا، جو ہر قسم کے اتار چڑھاؤ اور گرم و سرد کے باوجود نسل در نسل جاری رہ سکتا تھا۔ امریکہ کی موجودہ ترقی دراصل اس کی دو سو سالہ قومی جدوجہد کا مجموعی نتیجہ ہے۔ اگر امریکہ کے رہنما اپنی قوم کو ایسے راستوں پر چلاتے جس کا تسلسل

قوانین فطرت کے مطابق ممکن نہ تھا تو اس کو کبھی یہ ترقی حاصل نہ ہوتی۔

یہ قابل بقا پروگرام کیا تھا جو امریکی قوم نے اپنے لیڈروں کی رہنمائی میں اختیار کیا۔ یہ بنیادی طور پر دو نکات پر مشتمل تھا ـــــ سائنٹفک ایجوکیشن اور مسابقت پر مبنی اقتصادیات۔ یہ دو نکاتی فارمولہ اپنے اندر بقا اور استمرار کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اس لیے اس کے نتائج نسل در نسل جمع ہوتے رہے یہاں تک کہ امریکہ اپنے موجودہ دور عروج تک پہنچ گیا۔

انھیں دو سو سالوں میں مسلم ملکوں میں بھی قربانی کی حد تک جاکر ملی احیار کی کوششیں کی گئیں مگر وہ سب کی سب ناکام رہیں۔ اس کا بنیادی سبب یہی ہے کہ مسلم رہنماؤں نے بار بار ملت کو ایسے راستوں پر دوڑایا جو حقیقی اسباب کے اعتبار سے قابل بقا (sustainable) نہ تھا چنانچہ کوششوں کا تسلسل بار بار ٹوٹتا رہا اور ان کا کوئی مجموعی نتیجہ ہمارے حصہ میں نہ آسکا

تاریخ کائنات

امریکہ کے اس سفر میں جو سبق آموز چیزیں دیکھیں ان میں سے ایک واشنگٹن کا نیشنل ایر اینڈ اسپیس میوزیم تھا۔ یہ ایک عظیم سنٹر ہے جس میں ہر قسم کے ہوائی جہاز اور خلائی گاڑیوں وغیرہ کے اصل نمونے رکھے ہوئے ہیں۔ اس میں چاند سے لائی جانے والی چٹان کا ٹکڑا بھی ہے جس کو ہم نے اپنے ہاتھ سے چھو کر دیکھا۔ اس قسم کے مختلف مناظر سے گزرتے ہوئے ہم لوگ اس کے وسیع پلینیٹریم میں پہنچے۔ یہاں بگ بینگ سے لے کر بعد کی کائنات تک کا منظر ایک بہت بڑی اسکرین پر دکھایا جاتا تھا۔ میں اور میرے ساتھی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ مکمل اندھیرے کے بعد سامنے کے وسیع پردے پر ایک روشنی ظاہر ہوئی۔ یہ بہت بڑے انڈے کی مانند ایک "سپر ایٹم" تھا۔ وہ وسیع خلا میں متحرک تھا۔ اس کے بعد وہ اچانک پھٹا اور پھر اس کے اندر سمٹے ہوئے روشن اجزاء اچانک وسیع خلا میں بکھر گئے۔ جیسے بے شمار پتنگ وسیع خلا میں اڑ رہے ہوں۔ یہ بگ بینگ کا واقعہ تھا جو ماہرین فلکیات کے مطابق، تقریباً ۲۰ بلین سال پہلے پیش آیا۔

اس کے بعد لامحدود خلا میں کہکشائیں اور ستارے اور سیارے بننا شروع ہوئے۔ یہاں تک کہ وہ شمسی نظام وجود میں آیا جس کے ایک حصہ میں انسان مقیم ہے۔ پھر شمسی نظام کے ایک سیارہ (زمین) پر نہایت بامعنی تبدیلیاں شروع ہوئیں، بارشیں ہوئیں، پانی کے دھارے بہنے لگے۔ پھر نباتات اور

حیوانات وجود میں آئے اور آخر میں انسان کا ظہور ہوا۔ یہ منظر کشی اتنی کامیاب تھی کہ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کہ ہم شہر کے ایک ہال میں نہیں ہیں بلکہ اتھاہ کائنات کے کسی مقام پر کھڑے ہو کر اس کی لامحدود وسعتوں میں پیش آنے والے اربوں سال کے واقعات کو دیکھ رہے ہوں۔

یہ پورا منظر اتنا حیرت ناک تھا کہ ایسا محسوس ہوا جیسے کہ میں تخلیقی عمل کے براہ راست مشاہدہ میں اس کے خالق کا بالواسطہ مشاہدہ کر رہا ہوں۔ میرے سامنے ایک زندہ اور متحرک کائنات تھی جو بزبان حال پکار رہی تھی کہ یہ ناممکن ہے کہ اس کے پیچھے کوئی حیّ و قیوم خدا موجود نہ ہو۔

ایک سیاح جو ہمارے ساتھ اس مشاہدہ میں شریک تھا، بعد کو اس سے خدا کے وجود پر گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ حقائق بتا رہے ہیں کہ اس دنیا میں ہمارے لیے بے خدا کائنات اور باخدا کائنات کے درمیان انتخاب نہیں ہے۔ بلکہ حقیقی انتخاب باخدا کائنات یا غیر موجود کائنات میں ہے۔ یعنی اگر ہم خدا کے وجود کا انکار کریں تو ہم کو خود کائنات کے وجود کا انکار کرنا پڑے گا۔ چونکہ ہم اپنے تجربہ کی بنا پر کائنات کے وجود کا انکار نہیں کر سکتے۔ اس لیے ہم مجبور ہیں کہ خدا کے وجود کا اقرار کریں :

There has always been the question,, "If God created us, then who created God." But, with the discovery of the Big Bang, the question has been settled. After this discovery, the option for us is not between the universe with God and the universe without God. Instead the real option is between universe with God or no universe at all.

ایک گفتگو

امریکہ کے اس سفر (فروری ۱۹۹۸) کا ایک تجربہ قابل ذکر ہے۔ اس وقت میڈیا میں ہر جگہ عراق کے صدر صدام حسین کے معاملہ کا چرچا تھا۔ صدام حسین اقوام متحدہ کی مشاہداتی ٹیم کو اپنے یہاں ہتھیاروں کے ذخیرے کی کھلی جانچ کی اجازت دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اور امریکہ صدر کلنٹن کی قیادت میں بار بار یہ دھمکی دے رہا تھا کہ اگر صدام حسین نے اپنا رویہ نہیں بدلا تو عراق کو امریکی بمباری کا سامنا کرنا پڑے گا۔

میں نے دیکھا کہ اس معاملہ میں ہندستان کے مسلمانوں سے لے کر امریکہ کے مسلمانوں تک سب کی رائے ایک ہے۔ ساری دنیا کے مسلمان تقریباً متفقہ طور پر صدام حسین کی حمایت کر رہے ہیں اور امریکہ کی کھلی مذمت۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مسلمان اس معاملہ کو وقار کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ انھوں نے اس کو مشترک قومی وقار کا مسئلہ بنا لیا ہے۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر ہر مسلمان یہ محسوس کرتا ہے کہ صدام حسین کی جیت

ملت کی جیت ہے اور اس کی ہار ملت کی ہار۔ میں وقار کے اس تصور کو ایک جاہلی تصور سمجھتا ہوں۔ میرے نزدیک اصل مسئلہ وقار کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ دعوت کا مسئلہ ہے۔ مسلمانوں پر فرض کے درجہ میں ضروری ہے کہ وہ ہر ایسی کارروائی سے بچیں جو داعی گروہ اور مدعو گروہ کے درمیان غیر معتدل فضا پیدا کرنے والی ہو، خواہ اس کی خاطر انھیں یک طرفہ قربانی کرنی پڑے۔ میرے نزدیک صدام حسین اور اس طرح کے دوسرے لیڈر جنھوں نے مغربی قوموں کے خلاف محاذ آرائی کر کے نفرت کی فضا بنائی وہ بلاشبہ مجرم ہیں۔ بزعم خود وہ اپنے آپ کو مغرب کا قاتل سمجھتے ہیں مگر حقیقۃً وہ دعوت کے قاتل ہیں۔ انھوں نے خدا کے منصوبۂ دعوت کو تباہ کرنے کا جرم کیا ہے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ عراق اور امریکہ کے معاملہ کو مشرقی دادا اور مغربی دادا کی نزاع قرار دیں نہ کہ اسلام اور دشمن اسلام کی نزاع۔

عدالت کسی نزاع کو صرف انصاف کی نظر سے دیکھتی ہے۔ مگر داعی کی سوچ اس سے مختلف ہوتی ہے۔ داعی ایسے معاملات کو مصلحتِ دعوت کی نظر سے دیکھتا ہے نہ کہ محض قانونی انصاف کی نظر سے۔

نیا کمپیوٹر

امریکہ کی ایک صفت یہ ہے کہ وہاں ریسرچ کا عمل مسلسل جاری رہتا ہے۔ اس لیے ہر سال ان کے یہاں نئی نئی ٹکنیک سامنے آتی رہتی ہیں۔ حال میں ایک نئی ٹکنیک کے مطابق نئے قسم کے کمپیوٹر تیار کیے گئے ہیں۔ یہ کمپیوٹر اب بازار میں بھی آ گئے ہیں۔ ان کی صفت یہ ہے کہ آپ اس کے سامنے صرف بولیں گے اور کمپیوٹر اپنے آپ اس کو ٹائپ کرتا چلا جائے گا۔ اس نئے کمپیوٹر کا نام عام زبان میں بذریعہ آواز (via voice) ہے۔ مزید عجیب بات یہ ہے کہ وہ بہت سستا ہے۔ اس وقت امریکہ میں اس کی قیمت صرف ایک سو ڈالر ہے۔

جب میں اس قسم کی صنعتی ترقیوں کو دیکھتا ہوں تو میری زبان پر یہ لفظ آجاتا ہے — امکانات جنت کا تعارف۔ موجودہ صنعتی ترقی پوری کی پوری مجھے ایک ایسے آئینہ کی مانند معلوم ہوتی ہے جس میں جنت کے مناظر کو دور سے دیکھا جا سکتا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ راحت اور مسرت کی جو چیزیں جنت کے اندر اپنی معیاری صورت میں دی جانے والی ہیں، وہ تمام چیزیں موجودہ دنیا ہی میں غیر معیاری صورت میں رکھ دی گئی ہیں۔ یہ تعارفی چیزیں اس لیے تھیں کہ انسان ان کو دیکھ کر ابدی جنت کا شائق بنے۔ مگر نادان انسان انھیں تعارفی چیزوں پر ٹوٹ پڑا۔ اور اس طرح اپنے آپ کو حقیقی راحت و مسرت سے محروم کر لیا۔

ھدایت کا راز

امریکہ میں مسلمانوں کی ایک مجلس میں قرآن کا درس دیتے ہوئے میں نے کچھ باتیں کہیں۔ ان میں سے ایک بات یہ تھی۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ : یہ اللہ کی کتاب ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ وہ ہدایت ہے متقیوں کے لیے (البقرہ ۲)

قرآن غیر مشتبہ طور پر کتاب حق ہے۔ اس کے باوجود اس سے ھدایت حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے پڑھنے والے کے اندر تقویٰ کی صفت موجود ہو۔ گویا کہ یہ ففٹی ففٹی (نصف نصف) کا معاملہ ہے۔ ھدایت کا نصف تعلق قرآن سے ہے، اور اس کا بقیہ نصف تعلق پڑھنے والے سے۔ پڑھنے والا اگر اپنے حصہ کی نصف شرط کو پورا کرے تو وہ قرآن سے ھدایت پائے گا، اور اگر وہ اپنے حصہ کی شرط کو پورا نہ کرے تو قرآن کو پڑھنے کے باوجود وہ اس سے ھدایت نہیں پا سکتا۔

تقویٰ سے مراد احتیاط اور سنجیدگی ہے۔ غیر محتاط یا غیر سنجیدہ ذہن یہ کرے گا کہ قرآن کی ایک آیت لے کر اپنے ذوق کے مطابق وہ اس کا ایک مطلب نکالے گا اور غیر ذمہ دارانہ انداز میں اس پر تقریر شروع کر دے گا لیکن جس آدمی کے اندر احتیاط اور سنجیدگی کا مزاج ہو وہ قرآن کو پڑھ کر اس پر کھلے ذہن کے ساتھ غور کرے گا۔ وہ اس معاملہ میں دوسرے علماء اور مفسرین کی رائے جاننے کی کوشش کرے گا اس طرح تمام ضروری شرطوں کی تکمیل کے بعد قرآن کا ایک مفہوم متعین کرے گا۔

میں نے کہا کہ آپ کا حاملِ قرآن ہونا اس بات کی ضمانت نہیں کہ آپ ھدایت یاب بھی ہیں۔ ھدایت یاب ہونے کے لیے ایک اور چیز لازمی طور پر ضروری ہے، اور وہ ہے آپ کا حامل تقویٰ ہونا۔ جو لوگ صاحب کتاب ہوں مگر وہ صاحب تقویٰ نہ ہوں تو وہ قرآن کے الفاظ میں ــــ کمثل الحمار یحمل اسفاراً (الجمعہ) کا مصداق ہیں۔

غیر عملی نظریہ نہیں

ایک مجلس میں میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ کے انتہا پسند مسلم مفکرین نے غیر ضروری طور پر مسلمانوں کو اس برائی میں مبتلا کر دیا جس کو قرآن میں لم تقولون مالا تفعلون (الصف) کہا گیا ہے۔ یعنی کہنے اور کرنے میں تضاد۔ ان لوگوں نے خود ساختہ طور پر اسلام کی یہ تعبیر پیش کی کہ جو نظام خدا کی حاکمیت کے اصول پر قائم نہ ہو وہ طاغوتی نظام ہے اور ایسے نظام سے عملی تعاون کسی حال میں جائز نہیں،

نہ براہ راست اور نہ بالواسطہ۔ بہت سے لوگ اپنی نوجوانی کی عمر میں اس نظریہ سے متاثر ہوئے۔ انھوں نے اس کو اپنا عقیدہ بنالیا، مگر بعد کو جب وہ زندگی کے میدان میں داخل ہوئے تو معلوم ہوا کہ یہ نظریہ سرے سے قابل عمل ہی نہیں۔ ان لوگوں میں یہ جرأت نہ تھی کہ وہ اعلان کر دیں کہ جس نظریہ کو ہم کامل صداقت سمجھ بیٹھے تھے وہ محض ایک خیالی فریب تھا۔ اس لیے انھوں نے دوسرا طریقہ اختیار کیا۔ انھوں نے فکری غلطی کا اعتراف کیے بغیر عملی طور پر مفروضہ طاغوتی نظام سے ہم آہنگی اختیار کر لی۔ مگر یہ واضح طور پر دوعملی کی روش تھی۔ بدقسمتی سے موجودہ زمانہ میں ہزاروں مسلمان اس دوعملی میں اپنے صبح و شام گزار رہے ہیں۔ وہ اپنی غلطی کا اعتراف نہ کرنے کی قیمت زیادہ مہنگی صورت میں ادا کر رہے ہیں۔

میں نے کہا کہ مذکورہ معاملہ میں جو بات غلط تعبیر کی بنا پر پیدا ہوئی وہی بات ایک اور اعتبار سے قومیت کے غلط تصور کے نتیجہ میں پیدا ہوئی ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان عام طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ "قوم مذہب سے بنتی ہے نہ کہ وطن سے"۔ اس نظریہ نے انھیں ساری دنیا میں عجیب قسم کی دوعملی میں مبتلا کر دیا ہے۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ۱۹۹۱ میں جب امریکہ نے عراق پر حملہ کیا تو تمام مسلمان اسی قومی تصور کی بنا پر عراق کے حامی ہو گئے۔ اس کا تقاضا تھا کہ وہ امریکہ (اور اس کے حامی دوسرے مغربی ملکوں) سے قطع تعلق کر لیں۔ مگر غالباً کسی بھی مسلمان نے ایسا نہیں کیا۔ وہ اپنے عقیدہ کے مطابق، اس پالیسی کو باطل سمجھنے کے باوجود انھیں ملکوں سے وابستہ رہے۔

امریکہ کے سفر میں میری ملاقات ایک امریکی مسلمان سے ہوئی۔ انھوں نے گفتگو کے دوران کہا کہ امریکہ اسلام کا دشمن نمبر ایک ہے۔ میں نے کہا کہ اگر یہ بات صحیح ہے تو آپ اس دشمن نمبر ایک کی مشین کا پرزہ ہیں۔ یہی نفسیات امریکہ میں بسنے والے بیشتر مسلمانوں کی ہے۔ وہ فلسطین جیسے معاملات میں امریکی پالیسی کو اپنے دینی احساسات کے سراسر خلاف سمجھتے ہیں۔ اگر ان کے یہ احساسات درست ہوں تو انھیں امریکہ کی شہریت چھوڑ دینا چاہیے اور اس کا بائیکاٹ کرنا چاہیے۔ مگر میرے علم کے مطابق کوئی بھی امریکی مسلمان نہیں جس نے ایسا کیا ہو۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اس قسم کے مسلمان مسلسل طور پر دوعملی کا شکار ہیں۔ وہ اپنے عقیدہ کے اعتبار سے ایک چیز کو باطل سمجھتے ہیں اس کے باوجود وہ اس کے شریک و سہیم ہیں۔ اپنے عقیدہ

کے مطابق ان پر لازم تھا کہ وہ اس "طاغوت" سے قطع تعلق کریں مگر وہ اس سے کامل تعاون کا طریقہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔

میں امریکہ یا کسی اور مغربی ملک میں قیام کو غلط نہیں سمجھتا۔ میرے نزدیک اس قسم کے تمام معاملات قومی معاملات ہیں نہ کہ اسلامی عقیدہ کے معاملات۔ اگر آپ ان معاملات کو قومیت کے خانہ میں رکھیں تو آپ دوعملی کا شکار ہوئے بغیر ان ملکوں میں ان کے نظام کے تحت رہ سکتے ہیں۔ مگر جب آپ ایسے معاملات کو عقیدہ کا مسئلہ بنالیں تو اس کے بعد موجودہ روش یقینی طور پر دوعملی کی روش بن جاتی ہے۔ اور دوعملی کی روش بلاشبہ اسلام میں سب سے زیادہ بری چیز ہے۔

نابھی کا مسئلہ

ایک صاحب سے امن کے سوال پر گفتگو ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ اس وقت مسلمانوں کے ساتھ ہر جگہ بے انصافی کی جارہی ہے۔ سب سے پہلے ضرورت ہے کہ اس بے انصافی کو ختم کرنے کی کوشش کی جائے۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے لیے امن سے زیادہ اہم چیز انصاف ہے۔ ہم امن کی خاطر انصاف کی قربانی نہیں کر سکتے:

Justice is more important than peace. We cannot sacrifice justice for peace.

یہ سوچ کی غلطی ہے۔ اس وقت مسئلہ انصاف کے لیے کوشش کرنے کا نہیں ہے۔ بلکہ یہ ہے کہ ہم اس سوال پر غور کریں کہ سو سال کی کوششوں کے باوجود انصاف کیوں حاصل نہیں ہوا۔ جب اس طرح غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ کوشش کا یہ رخ ہی غلط تھا۔ اس طرح کے حالات میں کوشش کا نشانہ انصاف نہیں ہوتا بلکہ امن ہوتا ہے۔ اصل ضرورت یہ تھی کہ دونوں فریقوں کے درمیان امن کی حالت قائم کی جائے تاکہ انصاف کو حاصل کرنے کا راستہ کھلے۔ انصاف نتیجہ ہے اور امن تدبیر۔ ہمارے رہنماؤں نے یہ غلطی کی کہ انھوں نے نتیجہ کو تدبیر کا درجہ دے دیا۔ گویا کہ وہ دیوار بنانے سے پہلے چھت بنانے لگے۔ ایسی کوشش موجودہ عالم اسباب میں کبھی نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی۔

تخلیقی فکر

مسٹر فاروق چشتی کمپیوٹر ایکسپرٹ ہیں۔ وہ نیوجرسی کے علاقہ میں رہتے ہیں۔ ان سے ایک گفتگو

کے دوران میں نے کہا کہ میرے نزدیک موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اس دور میں ان کے درمیان کوئی تخلیقی مفکر (creative thinker) پیدا نہ ہو سکا۔ ہمارے تمام بڑے بڑے ذہن منفی ردعمل کا شکار رہے، اور منفی ردعمل کی نفسیات کے ساتھ کبھی تخلیقی فکر پیدا نہیں ہوتا۔

مثال کے طور پر اقبال کو لیجئے۔ ان کا کلام بتاتا ہے کہ وہ مغربی تہذیب کے بارے میں منفی نفسیات کا شکار تھے۔ اس سلسلہ میں ان کا ایک شعر یہ ہے :

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

اس شعر کے مطابق، مغربی تہذیب کمزور شاخ (بالفاظ دیگر باطل فکر پر) قائم ہے، اس لیے اس کا مقدر یہ ہے کہ وہ زوال کا شکار ہو جائے۔ عجیب بات ہے کہ اقبال مغربی تہذیب کے بارے میں جو بات مستقبل کے صیغہ میں کہہ رہے ہیں اسی بات کو انھوں نے خود مسلم تہذیب کے بارے میں ماضی کے صیغہ میں بیان کیا ہے۔ یعنی جو حادثہ ان کے نزدیک مغربی تہذیب کے ساتھ آئندہ پیش آنے والا ہے وہ مسلم تہذیب کے ساتھ آج ہی پیش آچکا ہے۔ اس سلسلہ میں ان کا یہ شعر پڑھئے :

رو لے اب دل کھول کر اے دیدۂ خوں نابہ بار وہ نظر آتا ہے تہذیب حجازی کا مزار

اقبال اپنی قومی تہذیب کے بارے میں عصبیت کا شکار تھے، اور غیر قوم کی تہذیب کے خلاف نفرت میں مبتلا تھے اس لیے وہ تضاد فکری کا شکار ہو گئے، اگر وہ نفرت اور تعصب سے بلند ہوتے تو ان کو معلوم ہوتا کہ یہ کمزور شاخ کا معاملہ نہیں ہے بلکہ یہ فطرت کے قانون کا معاملہ ہے۔ اسلام اپنے اصول کے اعتبار سے بلاشبہ ایک ابدی صداقت ہے۔ مگر مسلمان مادی اور سیاسی معنوں میں جو تاریخ بنائیں اس کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ مادی اور سیاسی تاریخ کا معاملہ ایک قومی معاملہ ہے۔ جس طرح ایک فرد حیاتیاتی اعتبار سے عروج اور زوال کا شکار ہوتا ہے اسی طرح قومیں بھی مادی اور سیاسی اعتبار سے عروج اور زوال کا شکار ہوتی ہیں۔ یہ معاملہ ایک فطری معاملہ ہے جو مسلم قوموں کے ساتھ بھی اسی طرح پیش آتا ہے جس طرح دوسری قوموں کے ساتھ۔ مگر اقبال اپنے غیر تخلیقی فکر کی بنا پر اس فطری حقیقت کو سمجھنے سے معذور رہے۔ یہ ضروری ہے کہ اسلام اور مسلمان کو ایک دوسرے سے الگ کر کے دیکھا جائے۔ اس کے بغیر نہ اسلام کے بارہ میں صحیح رائے قائم ہو سکتی ہے اور نہ مسلمانوں کے بارہ میں۔

بے شکایت دل

ایک موقع پر میں نے کہا کہ امریکی مسلمانوں کو میرا پیغام یہ ہے کہ وہ ون مین ٹو مشن کے اصول پر اپنی زندگی کی تعمیر کریں۔ ڈالر کمانا ان کی ضرورت ہو اور دعوہ ورک ان کا مقصد۔ ایک صاحب نے کہا کہ دعوہ ورک کی بات تو ٹھیک ہے۔ مگر اسی کے ساتھ آپ کہتے ہیں کہ امریکیوں (اور مغربی قوموں سے) نفرت نہ کرو۔ یہ تو ناممکن ہے۔ یہ لوگ ہمارے اوپر کھلی زیادتیاں کرتے ہیں۔ پھر کیسے ممکن ہے کہ ان کے خلاف نفرت ہمارے دل میں نہ پیدا ہو۔

میں نے کہا کہ دعوت مدعو کے ساتھ خیر خواہی کا عمل ہے۔ اس کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے کہ مدعو کے خلاف نفرت کو یک طرفہ طور پر ختم کر دیا جائے۔ وہ زیادتی کریں تب بھی اس پر صبر کرتے ہوئے ان کے خیر خواہ بنے رہیں۔ دعوت بہت بڑی عبادت ہے۔ اس عبادت کا کریڈٹ صرف ان حوصلہ مندوں کے لیے مقدر ہے جو مدعو گروہ کی زیادتیوں کے باوجود یک طرفہ صبر کی قربانی دیں۔ نماز کے لیے جس طرح وضو کے ذریعہ پاکی ضروری ہے، اسی طرح دعوت کے لیے بے شکایت دل درکار ہے۔ وضو کے بغیر نماز نہیں۔ اسی طرح بے شکایت دل کے بغیر دعوت نہیں۔

تیسرا آپشن نہیں

امریکہ کے سفر میں مجھے وہاں کے ایک اسلامک سنٹر ٹرنٹن میں ایک جلسہ کو خطاب کرنے کا موقع ملا۔ آخر میں سوال و جواب کا وقفہ تھا۔ ایک امریکی مسلمان نے سوال کیا کہ آج کل امریکہ اور عراق کے درمیان جنگی فضا بن رہی ہے۔ اگر جنگ ہو تو کیا ہمارے لیے یہ جائز ہوگا کہ ہم امریکہ کا ساتھ دے کر عراق سے لڑیں۔ جب کہ امریکہ ایک غیر مسلم ملک ہے اور عراق ایک مسلم ملک۔

میں نے کہا کہ آپ لوگ ایک حلف نامہ کو پُر کر کے امریکہ کے شہری بنے ہیں۔ اس میں صاف طور پر یہ لکھا ہوا ہے کہ اگر کسی ملک سے امریکہ کی جنگ ہو تو آپ امریکہ کی طرف سے لڑیں گے۔ ایسی حالت میں آپ کے لیے انتخاب جنگ میں شرکت اور عدم شرکت کے درمیان نہیں ہے بلکہ جنگ میں شرکت یا امریکی شہریت کو چھوڑنے کے درمیان ہے۔ اب آپ کو خود یہ فیصلہ کرنا ہے کہ آپ کس کو لیں اور کس کو نہ لیں:

For you, the option does not lie between going to war or not going to war. Instead the actual option is between going to war or renounce the American citizenship.

یہ مسئلہ صرف امریکہ کے مسلمانوں کا نہیں بلکہ ہر جگہ کے مسلمانوں کا ہے۔ موجودہ صورت حال یہ ہے کہ مسلمان مسلم اکثریت کے ملکوں میں تو احساس وطنیت کے ساتھ رہتے ہیں۔ مگر مسلم اقلیت کے ملکوں میں وہ دوسرے باشندوں کے ساتھ اپنے آپ کو احساس وطنیت میں شریک نہ کر سکے۔ یہ صورت حال میرے نزدیک درست نہیں۔

میں نے کہا کہ آپ کو جاننا چاہیے کہ آپ جس ملک میں آباد ہیں وہاں اگر آپ کے کچھ حقوق ہیں تو اسی کے ساتھ لازمی طور پر آپ کی کچھ ذمہ داریاں بھی ہیں۔ اگر آپ کسی ملک میں وہاں کے دستور کے مطابق اپنے حقوق لینا چاہتے ہیں تو عین اسی دستور کے مطابق آپ کو اپنی ذمہ داریوں کو بھی ادا کرنا ہوگا۔ اس معاملہ میں آپ جیسے لوگوں کے لیے کوئی تیسرا آپشن نہیں ـــــ قرآن کے مطابق، مسلمانوں کو یا تو اپنے عہد کو پورا کرنا ہے یا عہد کو فریق ثانی کی طرف لوٹا دینا ہے (الانفال ۵۸)

مسلمان خواہ امریکہ میں ہوں یا کسی اور ملک میں، وہ وہاں ایک معاہدۂ وطنیت کے تحت ہیں، یہ معاہدہ کہیں تحریری صورت میں ہے اور کہیں غیر تحریری صورت میں۔ تاہم شرعی طور پر ان دونوں قسم کے معاہدوں میں کوئی فرق نہیں۔ شرعی اعتبار سے غیر تحریری معاہدہ کی پابندی بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ تحریری معاہدہ کی پابندی۔ بظاہر معاہدہ کو باقی رکھنا اور اندر اندر اس کے خلاف عمل کرنا ایک ایسا فعل ہے جس کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔

دوعملی کا یہی معاملہ خود مسلم ملکوں میں بھی ایک اور صورت میں پایا جاتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں بعض انتہا پسند مسلم مفکرین نے یہ نظریہ پیش کیا کہ اسلام ایک مکمل نظام ہے اور وہ ایک ناقابل تقسیم وحدت ہے۔ یعنی آپ کو نماز ادا کرنے کے ساتھ حکومت کو بھی لازمی طور پر اسلامی بنانا ہے۔ اگر آپ نماز، روزہ کریں مگر حکومت اور سلطنت کو اسلامائز نہ کریں تو آپ کی زندگی باطل زندگی ہوگی اور آخرت کی نجات آپ کے حصہ میں نہیں آئے گی۔

نوجوانوں کی ایک پوری نسل اس نظریہ سے متاثر ہوئی۔ اور وہ اپنے ملک کے مسلم حکمرانوں سے ٹکرا گئی کیونکہ ان کے عقیدہ کے مطابق، یہ مسلم حکمراں طاغوتی حکمراں تھے نہ کہ حقیقۃً اسلامی حکمراں۔ اس کے نتیجہ میں ان مسلم حکمرانوں نے ایسے مسلمانوں کو سختی سے کچل ڈالنے کی پالیسی اختیار کی۔ یہ تشدد انقلابی مسلمانوں کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ چنانچہ انھوں نے دھیرے دھیرے دوعملی کی پالیسی اختیار کر لی یعنی فکری

اعتبار سے اپنے سابقہ عقیدہ پر باقی رہنا مگر عمل کے اعتبار سے موجود سیاسی نظام سے ہم آہنگی اختیار کر لینا۔ یہ دوعملی آج تقریباً تمام مسلم ملکوں میں موجود ہے۔ اور اس نے لاکھوں لوگوں کو دوعملی کی پالیسی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ یہاں بھی میرا کہنا ہے کہ ان مسلم حکمرانوں سے ہم آہنگی اختیار کرنا ہرگز اسلامی عقیدہ کے خلاف نہیں۔ ان سے ہم آہنگی کرتے ہوئے بھی ایک شخص مکمل معنوں میں مسلمان بن سکتا ہے۔ مگر اس قسم کی زندگی کے جائز ہونے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی پہلے یہ اعلان کرے کہ اس کا سابقہ عقیدہ غلط تھا اور اب وہ اس کو غلو (انتہا پسندی) قرار دے کر اسے چھوڑ رہا ہے۔

صنعتی ترقی

جدید صنعتی انقلاب کا آغاز یورپ میں ہوا۔ بعد کو وہ امریکہ پہنچا۔ مگر اس سلسلہ میں ریسرچ کا زیادہ کام امریکہ میں ہوا۔ اور اب بھی ریسرچ میں امریکہ ہی سب سے آگے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعد کے دور میں صنعتی ترقی کا زیادہ بڑا درجہ امریکہ کو مل گیا۔

ترقی کا بہت گہرا تعلق ریسرچ سے ہے۔ امریکہ کو جن چیزوں کی ایجاد کا سہرا حاصل ہے ان میں سے ایک موٹر کار ہے۔ موٹر کار سب سے پہلے ۱۹ ویں صدی کے آخر میں امریکہ میں تیار کی گئی۔ اگرچہ یہ بات ابھی تک نزاعی ہے کہ کار کا پہلا موجد کون تھا۔ مگر اس سلسلہ میں جن چند لوگوں کے نام لیے جاتے ہیں ان سب کا تعلق امریکہ سے ہے۔

پہلی کار اپنی شکل کے اعتبار سے موجودہ زمانہ کے سائیکل رکشا سے بظاہر بہت کم مختلف تھی۔ مگر یہ ابتدائی کار اگر آج کسی کے پاس ہو تو اس کی قیمت انتہائی مہنگی رولس رائس کار سے بھی زیادہ ہوگی۔ اس دنیا میں کچھ چیزیں اپنی کوالٹی کے اعتبار سے اہم ہوتی ہیں اور کچھ چیزیں وہ ہیں جن کو ان کی تاریخ اہم بنا دیتی ہے۔

اسٹیم انجن سے چلنے والے سمندری جہاز اور ٹرینیں سب سے پہلے برطانیہ میں بنائی گئیں۔ مگر کار اور ہوائی جہاز کی ایجاد کا سہرا امریکہ کے سر ہے۔ ہندستان کی سڑکوں پر بھی لاکھوں کاریں دوڑتی ہیں اور امریکہ کی سڑکوں پر بھی۔ مگر دونوں میں بہت زیادہ فرق ہے۔ میں نے دیکھا کہ امریکہ میں کاروں کی کثرت کے باوجود فضائی کثافت کی وہ حالت نہیں جو بمبئی اور دہلی جیسے ہندستانی شہروں میں پائی جاتی ہے۔ دوسرا فرق سڑک کا ہے۔ میں نے اپنے سفروں کے درمیان پایا کہ امریکہ کے گاؤں کی سڑک بھی

FORD ON THE AMERICAN ROAD 1896-1983

MODEL A
FIRST FORD MOTOR COMPANY CAR
1903

MODEL B TOURING CAR
FIRST FORD 4-CYLINDER FORD
1905

MODEL K TOURING CAR
FIRST SIX-CYLINDER CAR
1906

MODEL T TOURING CAR
FIRST FORD MODEL T
1909

FORDSON TRACTOR
FIRST FORD TRACTOR
1917

MODEL T TRUCK
FIRST FORD TRUCK
1917

LINCOLN FOUR-DOOR SEDAN
FIRST FORD LINCOLN
1922

HENRY FORD'S FIRST CAR
1896

MODEL T TOURING CAR
LAST FORD MODEL T
1927

MODEL A FORDOR SEDAN
FIRST FORD MODEL A
1928

MODEL A STATION WAGON
FIRST FORD WAGON
1929

V-8 TUDOR SEDAN
FIRST FORD V-8
1932

MERCURY SEDAN
FIRST FORD MERCURY
1939

LINCOLN CONTINENTAL CABRIOLET
1941

FORD FORDOR SEDAN
1949

FORD THUNDERBIRD
1959

CONTINENTAL MARK II
1956

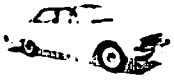

FORD FALCON
1960

LINCOLN CONTINENTAL
1961

FORD MUSTANG
1963

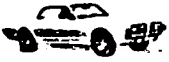

MERCURY COUGAR
1967

MERCURY MARQUIS
1969

FORD PINTO SQUIRE WAGON
1972

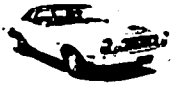

FORD MUSTANG II
1974

CONTINENTAL MARK V
1978

FORD FAIRMONT
1978

FORD CLUB WAGON
1978

FORD ESCORT
1982

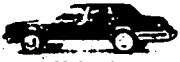

CONTINENTAL
1982

FORD SERIES 10 TRACTOR
1982

FORD RANGER
1983

دہلی کی سڑکوں سے بہتر تھی۔ امریکہ میں آپ ۵۰۰ میل کا سفر کر کے بھی اپنی منزل پر تازہ دم اتر سکتے ہیں جبکہ ہندستان کا یہ حال ہے کہ اگر آپ دہلی سے یوپی یا ھریانہ کی طرف جائیں تو صرف ۵۰ میل کے سفر پر آپ ذہنی تناؤ کا شکار ہو جائیں گے۔

فرق کیا ہے

انڈیا اور امریکہ میں جو غیر معمولی فرق ہے اس کی ایک علامتی مثال یہ ہے کہ انڈیا میں جب آپ دکان سے کوئی چیز خریدیں تو اس کے کیش میمو پر یہ لکھا ہوا ہوگا کہ —— ایک بار فروخت کیا ہوا سامان واپس نہیں لیا جائے گا :

Goods once sold will not be taken back.

اس کے برعکس امریکہ کے دکان دار قانونی طور پر پابند ہیں کہ اگر کوئی کسٹمر ۳۰ دن کے اندر خریدی ہوئی چیز کو واپس کرنے جائے تو دکان دار اس کو لینے سے انکار نہیں کر سکتا، بشرطیکہ وہ چیز غیر استعمال شدہ حالت میں ہو۔

جب یہ قانون پاس کیا گیا تو امریکہ کے دکان داروں نے ایسا نہیں کیا کہ وہ ھڑتال اور بند کا ہنگامہ شروع کر دیں جیسا کہ ایسے مواقع پر ہندستان جیسے ملکوں میں ہوتا ہے۔ اس کے برعکس انھوں نے یہ کیا کہ اپنے سامان اور سروس کی کوالٹی اور بھی زیادہ اچھی بنانے پر دھیان دینے لگے تاکہ گاہک ان کے سامان سے اتنا مطمئن ہو کہ خریدنے کے بعد وہ دوبارہ اس کو واپس کرنے کے لیے ان کے یہاں آنے کی ضرورت ہی نہ سمجھے۔

یہ صحت مند سماج کی پہچان ہے۔ صحت مند سماج کی ایک تعریف یہ ہے کہ اس کا دھیان ہمیشہ اپنے آپ کو زیادہ بہتر بنانے پر ہوتا ہے۔ دوسروں سے عدم اعتراف کی شکایت کرنا یا دوسروں کو منوانے کے لیے ان سے نزاع کرنا یہ صحت مند معاشرہ کا مزاج نہیں۔ اس علامتی مثال پر غور کیا جائے تو اس سے ترقی یافتہ سماج اور غیر ترقی یافتہ سماج کا فرق پوری طرح سمجھ میں آجائے گا۔

انتخابی پالیسی

امریکہ کے سفر میں مسلمانوں کی ایک میٹنگ میں مجھ سے انڈیا کے مسلمانوں کے بارے میں سوالات کیے گئے۔ ایک سوال یہ تھا کہ اس ماہ انڈیا میں عام انتخابات ہو رہے ہیں۔ اس میں

مسلمانوں کی پالیسی کیا ہے اور آپ کے خیال سے انھیں کیا کرنا چاہیے۔ میں نے کہا کہ یہ الکشن اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ سیاسی داداؤں کے دنگل کا ایک میدان ہے جس سے وہ اپنے ذاتی مقاصد کو حاصل کرسکیں۔ اس کا ۲۰ کروڑ مسلمانوں کے مسائل کے حل سے کوئی براہ راست تعلق نہیں:

These elections are nothing more than a wrestling ground for political dadas to grab the power only to secure their own material interests. It has nothing to do with the problems facing the 200 million people called the Muslim community of India.

میں نے کہا کہ موجودہ الکشن ہندستانی پارلی منٹ کا بارھواں الکشن ہے۔ مگر مسلمان اب تک اس سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔ ابھی تک انھوں نے اس سلسلہ میں کوئی پازیٹیو پالیسی نہیں بنائی۔ الکشن کے سلسلہ میں ان کی کوئی مثبت اور واضح پالیسی نہیں۔ اس کی وجہ الکشن کے بارے میں ان کی بڑھی ہوئی توقع (over-expectation) ہے۔ موجودہ قسم کے الکشن سے صرف وقتی اور محدود فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ مگر ہندستان کے مسلم رہنماؤں اور دانشوروں نے ان کا جو ذہن بنایا اس کی بنا پر وہ یہ سمجھنے لگے کہ جس پارٹی کو وہ ووٹ دیں اس کو چاہیے کہ وہ ان کے سارے ملی مسائل کو حل کردے۔ چونکہ ایسا ہونا ممکن نہیں اس لیے ہر بار ان کے ووٹ نگیٹیو ووٹنگ کا شکار ہوکر رہ جاتے ہیں۔

میں نے کہا کہ اس بار مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے لوگ عام طور پر یہ کہہ رہے ہیں کہ سیکولر امیدواروں کو ووٹ دو۔ مگر موجودہ دنیا میں کوئی لیڈر مسٹر سیکولر یا مسٹر آدرش نہیں، ہر لیڈر مسٹر انٹرسٹ ہے۔ آپ صرف یہ کرسکتے ہیں کہ کسی کے انٹرسٹ میں شریک ہوکر اس سے اپنے انٹرسٹ کی تکمیل میں مدد لیں۔

نیا چیلنج

ایک امریکی پروفیسر سے ملاقات ہوئی۔ ان سے گفتگو کے بعد اندازہ ہوا کہ اہل علم کی سطح پر نئے امریکی ذہن کی سوچ کیا ہے۔ یہ لوگ محسوس کرتے ہیں کہ سوویت یونین کے سقوط کے بعد امریکہ کو صرف ایک محدود مدت کے لیے خالی میدان ملا تھا۔ اب امریکہ کے خلاف دوبارہ عالمی سطح پر ایک نیا چیلنج ابھر رہا ہے۔ اگرچہ یہ سابق سوویت یونین کی طرح کسی ایک متحد طاقت کی طرف سے نہیں ہے بلکہ مختلف طاقتوں کے بظاہر غیر متحد ظہور کے نتیجہ میں پیش آیا ہے۔

مضبوط یورو پین یونین کا قیام، روس اور ایران کے درمیان بڑھتی ہوئی دوستی، صدام حسین کے سوال پر کویت کو چھوڑ کر تقریباً تمام مسلم ملکوں کا غیر موافق رویہ، اسرائیل اور عربوں کے درمیان اتحاد کی امریکی کوششوں کی ناکامی، مغربی طرز کی اقتصادیات میں آنے والا حالیہ بحران، اس قسم کے واقعات امریکہ کے لیے نیا چیلنج بن کر ابھرے ہیں۔ مستقبل کی تصویر اگرچہ ابھی واضح نہیں ہے۔ بظاہر یہ فضٹی ففٹی کا معاملہ ہے۔ موجودہ صدی کے خاتمہ تک امریکہ اگر اس قسم کے مسائل کے مقابلہ میں اپنی پوزیشن مستحکم کر سکے تو اگلی صدی میں اس کا داخلہ اس کے لیے اپنی سپر پاور حیثیت کے تسلسل کو برقرار رکھنے کے ہم معنی ہوگا۔ بصورت دیگر اگلی صدی کا آغاز گویا امریکہ کی برتر حیثیت میں زوال کا آغاز بن جائے گا۔

مسلم دنیا کے پاس بیک وقت دو چیزیں ایسی ہیں جو اس کو امکانی طور پر متبادل عالمی قیادت کا رول ادا کرنے کے قابل بناتی ہیں۔ یہ دو چیزیں ہیں —— اسلام کی آئیڈیالوجی اور قدرتی وسائل کی افراط۔ مگر مسلم دنیا کی بدقسمتی یہ ہے کہ اس کے اندر ناصر اور قذافی اور خمینی اور صدام جیسے غیر معتدل لیڈر ابھرے جنھوں نے مغرب سے محاذ آرائی کو اسلام کا سب سے بڑا کارنامہ سمجھا اور بقیہ مسلم دنیا نے براہ راست یا بالواسطہ طور پر ان کی تائید کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ واقعہ کا امکان بننا تو درکنار، اس منزل کی طرف سفر کا آغاز بھی اب تک نہ ہو سکا۔

ایک ایسا دین یا ایک ایسی آئیڈیالوجی جس سے ساری دنیا کو متوحش کر دیا گیا ہو، وہ اس قابل ہی نہیں رہتا کہ وہ لوگوں کے اوپر کوئی قائدانہ کردار ادا کر سکے۔ قیادت کا رول، قرآن کے مطابق، صبر کرنے والوں کے لیے مقدر ہے نہ کہ بے صبروں کے لیے (السجدہ ۲۴)

مادی کلچر

امریکہ کے سفر میں مجھے یہاں کے کئی ایسے گھروں میں جانے کا اتفاق ہوا جن کے پاس اچھا جاب ہے، اور عام تصور کے مطابق وہ خوش حال ہیں۔ اس سلسلہ میں مختلف تجربے پیش آئے۔ ایک صاحب کے گھر میں میں ان کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا تھا۔ اتنے میں خاتون خانہ تشریف لائیں۔ انھوں نے کہا کہ مولانا صاحب کیا میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں۔ میں نے کہا کہ ضرور بیٹھئے۔ اس کے بعد وہ پاس کی کرسی پر بیٹھ گئیں اور اچانک رونے لگیں۔ پھر انھوں نے کہا کہ مولانا صاحب ہمارے لیے دعا کیجئے۔ ہمارے لیے زندگی بہت تلخ ہو گئی ہے۔

اس طرح امریکہ میں مجھے کئی شاندار گھروں کے اندرونی حالات کا تجربہ ہوا۔ میں نے پایا کہ ان خوش نما گھروں کے اندر صرف ایک بے رونق زندگی پناہ لیے ہوئے ہے۔ میرے تجربہ میں شاید کوئی بھی نہیں جو حقیقی معنوں میں خوشی اور سکون کی زندگی گزار رہا ہو۔

"مادی ترقی اپنی انتہا پر پہنچ کر اپنی نفی بن جاتی ہے"

ایک ملاقات

جناب عرفان عمر صاحب امریکہ کی ایک یونی ورسٹی میں ریسرچ کر رہے ہیں۔ ان کی ریسرچ کا موضوع ہے: برصغیر ہند کے مسلم مفکرین۔ اس فہرست میں انھوں نے راقم الحروف کا نام بھی شامل کیا ہے۔ ان سے چند ملاقاتیں ہوئیں۔

موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں برصغیر ہند میں جو مسلم مفکرین اٹھے وہ میرے نزدیک سب کے سب وقتی حالات کی پیداوار تھے۔ حقیقت کے ابدی تناظر میں ان کا فکر نہیں بنا۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھی مسلمانوں کو وہ مثبت رہنمائی نہ دے سکا جو موجودہ زمانہ میں انھیں درکار تھی۔ مثلاً سرسید احمد خاں، غدر ۱۸۵۷ء کے حالات کے زیر اثر ابھرے۔ ترک کی عثمانی خلافت کے خاتمہ نے محمد علی کو پیدا کیا۔ ابوالکلام آزاد ہندستان میں قائم ہونے والے برٹش راج کی پیداوار تھے۔ محمد علی جناح کا ظہور ہندو فرقہ واریت کا نتیجہ تھا۔ ابوالاعلیٰ مودودی کا فکر مغربی تہذیب کے غلبہ کے ردعمل میں بنا، وغیرہ۔

میرا معاملہ ان سب لوگوں سے بالکل مختلف تھا۔ ان حضرات کی فکری نشوونما جن حالات میں ہوئی ان کا ہنگامہ اس وقت صرف شہروں میں ہوا کرتا تھا۔ ان سب لوگوں کی شخصیتیں انھیں شہری حالات کے تحت بنیں۔ مگر میرے ساتھ یہ اتفاق پیش آیا کہ میں یوپی کے ایک دور افتادہ گاؤں میں پیدا ہوا۔ تقریباً ۲۵ سال کی عمر تک میری زندگی اسی گاؤں یا اس کے آس پاس کے سادہ ماحول سے وابستہ رہی۔ حتی کہ میری تعلیم ایک ایسے مدرسہ میں ہوئی جو شہر سے بہت دور ایک ویرانے میں واقع تھا۔ میں اپنے گاؤں سے وہاں پیدل جاتا تھا تو یہ پورا راستہ ایسے مقامات سے گزرتا تھا جہاں کھیت اور باغ اور میدان جیسی چیزوں کے سوا کچھ اور میرے دیکھنے کے لیے نہ تھا۔

اس اعتبار سے میری زندگی انفرادی سطح پر بنو اسماعیل کی زندگی سے بہت ملتی جلتی ہے۔ بنو اسماعیل

کی پرورش متمدن دنیا سے بہت دور صحرائی ماحول میں ہوئی۔ ایسا ہی معاملہ میرا بھی تھا۔ میری نشوونما اپنے گاؤں اور اُس پاس کے ماحول میں اس طرح ہوئی جہاں میری ذہنی تربیت کے لیے صرف فطرت کی دنیا تھی ـــــ گاؤں کے سادہ لوگ، گائے اور بکری جیسی معصوم مخلوقات، کھیت اور باغ کی ہریالی، دریا اور میدان کے مناظر، سر کے اوپر پھیلا ہوا آسمان، دن کو صاف چمکتا ہوا سورج اور رات کو روشن ستاروں سے بھری ہوئی فضا، کثافت سے پاک ہوا، اور اس میں اڑتی ہوئی چڑیوں کے مناظر، وغیرہ وغیرہ۔

اس فطری ماحول میں منفی سوچ کے لیے کوئی گنجائش نہ تھی۔ یہ پوری کی پوری ایک مثبت دنیا تھی جہاں صرف مثبت سوچ ہی ابھر سکتی تھی اور یہی میرے ساتھ پیش آیا۔ اس فطری ماحول میں پرورش پانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو چیزیں میری پوری شخصیت میں رچ بس گئیں۔ یہ دو چیزیں یہ تھیں :

۱۔ سائنٹفک طرز فکر۔ سائنٹفک طرز فکر دراصل فطرت کے ابدی حقائق کی بنیاد پر بننے والی سوچ کا دوسرا نام ہے۔ اس سوچ کے اجزاء ہیں ـــــ آبجکٹیو تھنکنگ، آفاقی مزاج، وسیع تر انسانیت، حقیقت پر مبنی طرز فکر، باتوں کو ویسا ہی دیکھنا اور سمجھنا جیسا کہ وہ ہیں۔

۲۔ ردعمل کی نفسیات سے محفوظ رہنا۔ ردعمل کی نفسیات عام طور پر قومی مسائل اور حادثات کے زیر اثر بنتی ہیں۔ میں چونکہ ایسے مسائل سے عملاً بے خبر تھا اس لیے میری فکر کی تشکیل میں ان کا کوئی دخل نہ ہو سکا۔ میں نے کہا کہ وہ قومی مسائل اور حادثات جنھوں نے دوسرے لوگوں کی شخصیتیں بنائیں اگرچہ میں ان کے زمانہ میں پیدا ہو چکا تھا مگر عملاً میں ان سے بے خبر رہا۔ حتیٰ کہ ان واقعات کو میں نے بہت بعد کو اس وقت جانا جب کہ میں نے ان کو کتابوں میں پڑھا۔ اس وقت تک میری فکری شخصیت بن چکی تھی اس لیے وہ میرے لیے صرف واقفیت کا معاملہ تھا نہ کہ شخصیت کی تعمیر کا معاملہ۔

میں اپنے بارے میں کوئی اور دعویٰ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ مگر میں یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ شاید میں موجودہ زمانہ کے علماء میں واحد شخص ہوں جس کی شخصیت کی تعمیر وقتی حالات کے نتیجہ میں نہیں ہوئی بلکہ فطرت کی ابدی دنیا کے زیر اثر ہوئی۔

ایک تضاد

الجزائر اور ترکی کے کچھ افراد سے گفتگو ہوئی۔ وہ اپنے ملک کو چھوڑ کر اب امریکہ میں رہتے ہیں۔ انھوں نے اپنے ملک میں حکومت کے ظلم کی شکایت کی۔ میں نے کہا کہ آپ امریکہ میں کیوں رہتے

ہیں۔ انھوں نے کہا کہ یہاں پیس ہے۔ میں نے کہا کہ بات اتنی سادہ نہیں ہے۔ آپ امریکہ میں پیس کی پرائس دے رہے ہیں اس لیے یہاں پیس ہے۔ اور اپنے ملک میں آپ یہ پرائس دینے کے لیے تیار نہیں اس لیے وہاں پیس بھی نہیں۔

انھوں نے کہا کہ کیا پرائس۔ میں نے کہا کہ ایک لفظ میں یہ پرائس ایڈجسٹمنٹ ہے۔ ہر ملک میں کچھ مطلوب چیزیں ہوتی ہیں اور کچھ غیر مطلوب چیزیں۔ اگر آپ غیر مطلوب چیزوں کو نظر انداز کر کے مطلوب چیزوں پر قناعت کریں تو اسی کا نام امن ہے۔ اور اگر یہ چاہیں کہ سب کچھ آپ کی مرضی کے مطابق ہو، کوئی غیر مطلوب چیز باقی نہ رہے تو اسی کے نتیجہ کا نام بدامنی ہے۔

میں نے کہا کہ یہ دوطرفہ صورت حال کسی مفروضہ ظالم کی قائم کردہ نہیں ہے بلکہ وہ خود فطرت کے قانون کی بنا پر ہے اس لیے وہ کبھی اور کسی سماج میں ختم ہونے والی نہیں۔ مسلم ملکوں میں جو لوگ نیا بہتر نظام قائم کرنے کے نام پر موجودہ حکمرانوں سے لڑ رہے ہیں، وہ اگر غالب ہوں اور موجودہ نظام کو ختم کر کے دوسرا نظام قائم کریں تو اس نئے نظام میں بھی عین یہی دوطرفہ صورت حال باقی رہے گی۔ اس کی واضح مثال مصر، افغانستان، پاکستان اور ایران جیسے ملک ہیں۔

جنت کا ٹکٹ

امریکہ میں تقریباً ڈیڑھ ہزار کی تعداد میں اسلامک سنٹر ہیں۔ یہاں اسلامک سنٹر کا مطلب ہوتا ہے مسجد اور اس کے ساتھ دوسرے ضروری شعبے مثلاً لائبریری، ہال، مہمان خانہ، مدرسہ، وغیرہ۔ ایک اسلامک سنٹر میں میرے کچھ پروگرام ہوئے۔ اس کے ذمہ دار کی طرف سے مجھے یہ پیش کش کی گئی کہ اب آپ یہیں رہیے۔ انڈیا کے بجائے امریکہ کو اپنا میدانِ کار بنائیے۔ آئندہ آپ ہی اس اسلامک سنٹر کے چیرمین ہوں گے۔ تاہم ان کے شدید اصرار کے باوجود میں وہاں سے واپس چلا آیا۔

ایک صاحب سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ جو مسلمان امریکہ میں آباد ہیں اور یہاں دعوت کا کام کر رہے ہیں ان کے لیے یہی درست ہے کہ امریکہ کو اپنا میدان سمجھیں۔ مگر جہاں تک میرا تعلق ہے میں انڈیا میں کام کرنے کو زیادہ پسند کرتا ہوں۔ میرا احساس یہ ہے کہ اگر میں صبر کے ساتھ انڈیا میں دعوتی کام کروں تو وہاں میرے لیے جنت کا یقینی ٹکٹ موجود ہے۔

بیرونی دنیا میں عام طور پر انڈیا کا تصور یہ ہے کہ یہاں مسلمانوں کو ستایا جاتا ہے۔ ٹرنٹن میں ایک

مسلمان (محمد عمر) نے انڈیا کے مسلمانوں کا ذکر اس طرح کیا جیسے کہ مسلمان یہاں دفن کیے جا چکے ہیں۔ میں نے کہا کہ اگر بالفرض انڈیا میں مسلمانوں کے ساتھ ظلم و زیادتی کا وہی معاملہ ہو رہا ہو جو آپ حضرات سمجھتے ہیں تو یہ ہمارے لیے ایک سنہری موقع (گولڈن چانس) ہے۔ کیونکہ حدیث میں آیا ہے کہ جتنی بڑی مصیبت اتنا ہی بڑا انعام (إن عظم الجزاء مع عظم البلاء) اس کے مطابق اگر ہم انڈیا جیسے ملک میں اسلام پر عمل کریں تو ہم کو ان مسلمانوں سے زیادہ ثواب ملے گا جو سہولت والے ملکوں میں اسلام پر عمل کر رہے ہوں۔

اسی طرح حدیث میں آیا ہے کہ: حجبت الجنة بالمكارة (فتح الباری ۱۱/ ۳۲۷) یعنی جنت تکلیفوں سے ڈھانک دی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو دعوتی کام امریکہ جیسے ملک میں آرام اور سہولت کے ساتھ ہو سکتا ہے وہ انڈیا میں تکلیف اور دل آزاری کے ماحول میں انجام دینا ہے۔ اگر ایسا ہو تو انڈیا میں ہمارے لیے جنت کا یقینی ٹکٹ موجود ہے۔ انڈیا میں ہم ناگوار حالات کے درمیان اسلامی دعوت کا کام کر کے زیادہ یقینی طور پر جنت کا استحقاق حاصل کر سکتے ہیں۔ إن شاء اللہ العزیز۔

طاقت ور نظریہ

مولانا ذکی الدین صاحب ماونٹ ہالی اسلامک سنٹر کے صدر ہیں۔ وہ یہاں عام طور پر امام ذکی کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کا اتفاق ہوا۔ ایک مجلس میں انھوں نے ایک مقولہ پیش کیا جو مجھ کو بہت پسند آیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ موجودہ دنیا میں اس نظریہ کو بقا ملتا ہے جو زیادہ طاقتور ہو:

Let the strongest idea survive.

میں نے کہا کہ یہ مقولہ سب سے زیادہ اسلام کے بارے میں درست ہے۔ اسلام کی حیثیت بلاشبہہ دوسرے نظریات کے مقابلہ میں سپیریر آئیڈیالوجی کی ہے۔ جب بھی اسلام کو نظریات کے میدان میں لایا جائے گا ہمیشہ برتری اسلام ہی کو حاصل ہوگی۔

پھر میں نے کہا کہ اسلام اگرچہ امکانی طور پر آج بھی سپر پاور کی حیثیت رکھتا ہے مگر عملی طور پر اس کو آج کی دنیا میں غالب نظریہ کی حیثیت حاصل نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کو نظریاتی مقابلہ کے میدان میں لایا ہی نہیں گیا۔ یہ کام مسلمانوں کے ذریعہ ہونا تھا۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے اسلام کو تو دنیا کے سامنے پیش نہیں کیا۔ البتہ اسلام کے نام پر انھوں نے دوسری قوموں سے نفرتیں کیں اور ان سے مادی اور سیاسی جھگڑے قائم کیے۔ مسلمانوں کی یہ روش میڈیا کے ذریعہ خوب عام ہوئی۔

یہاں تک کہ لوگ اسلام کو ٹکراؤ اور تنگ نظری اور تشدد کا مذہب سمجھنے لگے۔ یہی منفی فضا ہے جو اسلام کی اشاعت میں واحد رکاوٹ ہے۔

میں نے کہا کہ اگر آپ کارخانہ دار ہیں اور نہایت اعلیٰ کوالٹی کا ایک سامان اپنے یہاں تیار کرتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ آپ ایسا عمل بھی کر رہے ہیں جو متوقع کسٹمر کمیونٹی کو آپ سے متنفر کرنے والا ہو تو آپ کا سامان اعلیٰ کوالٹی کے باوجود فروخت ہونے والا نہیں۔

ایسا ہی معاملہ اسلام کا بھی ہے۔ اسلام بلاشبہ اپنی اصل صفات کے اعتبار سے لوگوں کا ایک مطلوب مذہب ہے۔ مگر اسلام اور اس کے مخاطبین کے درمیان مسلمان حائل ہو گئے ہیں۔ یہ حائل ہونا ان کے ذاتی کردار یا اعمال کے اعتبار سے نہیں ہے۔ بلکہ اس اعتبار سے ہے کہ وہ اپنی متشددانہ تحریکوں کو اسلام کے نام پر چلاتے ہیں۔ وہ تنگ نظری اور عدم رواداری پر مبنی اپنی قومی تحریکیں چلاتے ہیں اور اس کو اسلامی تحریک کا نام دے دیتے ہیں۔ اسلام کے نام پر اٹھائی جانے والی یہی غیر اسلامی تحریکیں اسلام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ یہ اسلام کی تصویر کو بگاڑ کر غیر حقیقی طور پر لوگوں کو اس سے متنفر کر رہی ہیں۔

میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں اسلامی دعوت کا آغاز جہاں سے ہوگا وہ یہ ہے کہ مسلمان یا تو دوسری قوموں کے مقابلہ میں اپنی حریفانہ اور متشددانہ تحریکوں کو ختم کر دیں یا کم از کم ایسا کریں کہ وہ ان تحریکوں کو اسلامی تحریک کا نام نہ دیں بلکہ ان کو صرف قومی یا دنیوی تحریکیں بنائیں۔ مسلمان اگر ایسا کریں تو اسلام خود اپنی طاقت سے پھیلنے لگے گا۔ اس کے بعد کوئی بھی چیز اس کا راستہ روکنے والی نہیں۔

ایک تقریر

جناب ابراہیم شیخ نیویارک میں رہتے ہیں۔ اور الرسالہ کے پرانے قاری ہیں۔ انھوں نے اپنے علاقہ کی مسجد میں جمعہ کے دن ایک تقریر کا انتظام کیا۔ یہ ایک چار منزلہ مسجد ہے۔ لوگوں نے بتایا کہ اس کی سب منزلیں پوری طرح بھری ہوئی تھیں اور ہر منزل پر مائیک کا بہت اچھا انتظام تھا۔ مسجد کی نسبت سے میں نے خالص دینی انداز میں آدھ گھنٹہ کی ایک تقریر کی۔ اس میں کچھ حدیثیں سنائیں اور کچھ صحابہ کے واقعات بیان کیے۔ اور پھر ان کی سادہ تشریح کی۔ میرا حال یہ ہے کہ تقریر کے دوران میں خود اپنے آپ میں گم رہتا ہوں اس لیے مجھے حاضرین کے تاثر کا کچھ اندازہ نہیں ہوتا۔

دہلی واپس آنے کے بعد نیویارک سے جناب ابراہیم صاحب کا ٹیلی فون آیا۔ انھوں نے کہا کہ آپ کی تقریر کے بارے میں لوگوں کا تاثر بہت غیر معمولی تھا۔ لوگوں نے بتایا کہ تقریر کے دوران تمام حاضرین رو رہے تھے۔ ایسا عجیب منظر تھا جو اس سے پہلے کسی تقریر میں ہم نے نہیں دیکھا تھا۔

میرا احساس یہ ہے کہ حدیث اور واقعات صحابہ کی صورت میں ہمارے پاس جو ذخیرہ ہے وہ ایسا ہے جو ذہنوں کو ہلا دے اور دلوں کو پگھلا دے۔ مگر عام واعظین اور خطباء اکثر ایسا کرتے ہیں کہ وہ حدیث اور واقعات صحابہ کے ساتھ غیر متعلق چیزیں ملا دیتے ہیں۔ مثلاً شاعروں کے اشعار، موضوع روایات، بے بنیاد قسم کی پراسرار کہانیاں، وغیرہ۔ اس ملاوٹ کی بنا پر ان کی تقریریں اپنا اثر کھو دیتی ہیں۔ اصلی باتوں کے ساتھ نقلی باتیں اور حقیقت کے ساتھ افسانہ کی آمیزش کی یہ برائی پچھلی قوموں میں پیدا ہوئی جس کے نتیجہ میں ان کا دین بے اثر ہو کر رہ گیا۔ یہی خرابی اب خود مسلمانوں میں بہت بڑے پیمانہ پر دیکھنے میں آرہی ہے۔

امتیاز نہیں

مسٹر فاروق چشتی نے کہا کہ امریکہ میں مسلمانوں کے ساتھ امتیازی سلوک کیا جاتا ہے مگر مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میرے ساتھ یہاں اس قسم کے تجربات نہیں گزرتے جن کو لوگ امتیازی سلوک کہتے ہیں۔ اس قسم کی بات یہاں بھی ہے اور وہ بلا تفریق ہر سماج میں ہمیشہ مختلف اسباب سے موجود رہتی ہے۔ مگر میرا طریقہ یہ ہے کہ جب بھی میرے ساتھ اس قسم کا تجربہ پیش آتا ہے تو میں اس کو اپنی کمی پر محمول کرتا ہوں اور اس سے یہ سبق لیتا ہوں کہ مجھے مزید تیاری کر کے اپنے آپ کو اتنا اوپر اٹھانا چاہیے کہ کوئی مجھے نظر انداز نہ کر سکے۔ چنانچہ مجھے جس تجارتی ادارہ میں میں پہلے انٹرویو میں نہیں لیا گیا تھا، مزید تیاری کے بعد جب میں نے وہاں دوبارہ انٹرویو دیا تو وہ مجھ کو لینے پر مجبور ہو گئے۔

یہی موجودہ دنیا میں صحت مند نقطۂ نظر ہے۔ "امتیازی سلوک" کا نظریہ صرف پست ہمتی اور بے حوصلگی پیدا کرتا ہے مگر مذکورہ نظریہ حوصلے کو بڑھاتا ہے۔ یہاں تک کہ آدمی اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے مائنس کو پلس بنا لے۔ وہ بظاہر ناکامی میں بھی کامیابی کا نیا راز دریافت کر لے۔

اس کانفرنس میں مختلف تنظیموں اور مختلف مکتب فکر کے لوگ آئے تھے۔ ہر ایک اپنے اپنے انداز پر اپنی مطبوعات تقسیم کر رہا تھا۔ ایک صاحب نے مجھے ایک انگریزی مقالہ دیا، جو امریکہ میں مقیم ایک مسلمان پروفیسر کا لکھا ہوا تھا۔ یہ ہندستانی مسلمانوں کے مسئلہ کے اسلامی حل کے بارے میں تھا۔ اس کے عنوان کے الفاظ یہ تھے :

Indian Muslims: Is there an Islamic solution to the problems of Muslim minorities?

میں نے اس مقالہ کو پڑھا۔ اس کا پہلا جملہ یہ تھا کہ —— اقلیتیں ہر جگہ خطرہ کی حالت میں ہیں :

Minorities are at risk everywhere.

میں نے کہا کہ اس مقالہ کا پہلا جملہ ہی غلط ہے۔ اقلیتوں کا اسلامی حل بتانے والے اس مقالہ میں اقلیتوں کے لیے مستقل خطرہ کی خبر دی گئی ہے۔ مگر قرآن کا بیان اس معاملہ میں یکسر مختلف ہے۔ قرآن میں کہا گیا ہے کہ : کم من فئة قليلة غلبت فئة كثيرة باذن الله والله مع الصابرين (البقرة ۲۴۹) مذکورہ مقالہ نگار اسلام کے نام پر اقلیتی مسلمانوں کو خطرہ کی خبر دے رہے ہیں حالاں کہ قرآن کے مطابق، انھیں یہ بتانا چاہیے کہ تمہارا اقلیت میں ہونا تمہارے لیے ایک ایڈوانٹیج ہے نہ کہ کوئی ڈس ایڈوانٹیج۔

پھر میں نے کہا کہ یہ کوئی خوش فہمی کی بات نہیں ہے بلکہ فطرت کے قانون کی بات ہے۔ یہ ایک فطری تقاضا ہے کہ جو لوگ بظاہر اقلیت میں ہوں ان کے لیے اقلیت میں ہونا ایک چیلنج بن جائے۔ اس چیلنج کے نتیجہ میں ان کے اندر وہ اعلیٰ کردار ابھرے جو انھیں اکثریتی گروہ سے بھی زیادہ آگے بڑھا دے۔ اسی قانون فطرت کو مذکورہ آیت میں اذن اللہ کہا گیا ہے۔

امریکی گاؤں

امریکہ کے "گاؤں" میں بھی جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ گاؤں کیا تھے۔ نہایت عمدہ سڑک کے کنارے دور دور عمدہ مکانات، ان کے درمیان پارک، گاؤں میں ہر قسم کی جدید ترین سہولتیں اسی طرح موجود تھیں جس طرح شہروں میں۔ یہاں شہر اور گاؤں میں صرف یہ فرق ہے کہ شہر میں تجارتی سرگرمیاں

ہیں اور گاؤں میں پرسکون زندگی۔ یہاں کے گاؤں کو انڈیا کے فارم ہاوس پر قیاس کر سکتے ہیں۔ ہر گاؤں گویا بہت سے فارم ہاوسوں کا ایک مجموعہ ہوتا ہے۔ ان گاؤں میں عمدہ سڑکوں پر صرف ۲۵ میل کی رفتار سے گاڑی چلانے کی اجازت ہے۔

ہندستان میں گاؤں کا مطلب ہے ـــــ شہر کے مقابلہ میں پس ماندہ بستی۔ اور امریکہ میں گاؤں کا مطلب ہے ـــــ شہر کے مقابلہ میں پرسکون بستی۔ ہندستان کے شہروں میں امیر لوگ رہتے ہیں اور گاؤں میں غریب لوگ۔ مگر امریکہ کے گاؤں، برعکس طور پر امیروں کی بستی کے ہم معنی ہوتے ہیں۔

میرا احساس یہ ہے کہ کسی ملک کی ترقی کا نشان اس کے شہر نہیں ہیں بلکہ اس کے گاؤں ہیں یہ دراصل ملک کے گاؤں ہیں جن کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں ترقی کا معیار کیا ہے۔

ترقیات کی جدید دنیا میں ہندستان ابھی تک پچھڑا ہوا کیوں ہے اس کی واحد ذمہ داری ہماری لیڈر شپ پر آتی ہے۔ ہمارے لیڈر ۱۹۴۷ سے پہلے بھی صرف سیاسی دھوم مچاتے رہے اور ۱۹۴۷ کے بعد بھی وہ بدستور سیاسی دھوم میں مشغول رہے۔ حقیقی ترقیاتی عمل کے لیے انھوں نے کچھ نہیں کیا اس طرح انھوں نے سو سال کی قیمتی مدت کھو دی۔ جب کہ اسی سو سال میں امریکہ میں ترقی کا غیر معمولی عمل جاری رہا انھوں نے تعلیم اور سائنسی ریسرچ کو اپنا عملی میدان بنایا اس کے برعکس ہندستانی لیڈروں نے سیاسی دھوم بازی کو۔ یہی وہ فرق ہے جس نے دونوں ملکوں کے مستقبل کو ایک دوسرے سے مختلف بنا دیا۔

ایک صاحب نے کہا کہ میں ایک امریکی مسلمان ہوں۔ میرے جیسے مسلمانوں کے لیے آپ کا پیغام کیا ہے۔ میں نے کہا کہ میرا پیغام صرف ایک ہے ـــــ آپ ون مین ٹومشن کا مصداق بنیں۔ یعنی ڈالر کمانے کو ضرورت کا درجہ دیں اور دعوت کو اپنا مقصد حیات بنائیں۔

معاش ہر آدمی کی ایک لازمی ضرورت ہے ہر آدمی کو بہر حال اپنے لیے اور اپنے گھر والوں کے لیے کمانا ہے۔ یہ ایک ایسی ذمہ داری ہے جس سے کسی حال میں مفر نہیں مگر کمانا آدمی کی ضرورت ہے نہ کہ آدمی کا مقصد۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ کمانے کو صرف ضرورت کا درجہ دے اور جہاں تک زندگی کے مقاصد کا معاملہ ہے، وہ اعلیٰ تر اقدار کے حصول کو اپنا مقصد حیات بنائے۔

موجودہ دنیا میں یہ فرق بے حد مشکل ہو گیا۔ موجودہ زمانہ میں صنعتی انقلاب کے بعد پیدا

ہونے والے حالات نے دنیا کو اتنا زیادہ پرکشش بنا دیا ہے کہ لوگ اس پر اسی طرح ٹوٹ رہے ہیں جس طرح شمع کے اوپر پروانے ٹوٹتے ہیں۔ کاش آج کے انسان کو یہ بتایا جا سکے کہ تمہاری اس روش کا انجام بھی یقینی طور پر وہی ہے جو شمع پر ٹوٹنے والے پروانوں کا ہوتا ہے۔ یعنی وقتی راحت اور اس کے بعد ابدی تباہی۔

لاحاصل دھوم

مولانا امام ذکی نے بتایا کہ آخر عمر میں انھوں نے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی سے پوچھا کہ اپنی اسلامی تحریک کے انجام کے بارہ میں آپ کا تبصرہ کیا ہے۔ وہ چند منٹ خاموش رہے۔ اس کے بعد بولے کہ کوئی عمارت صرف اینٹوں سے نہیں بنتی، اینٹوں کے ساتھ اچھا مسالہ بھی درکار ہوتا ہے۔

تمثیل کی زبان میں ان کے جواب کا مطلب یہ تھا کہ ہمارے پاس فکر تھا مگر اس فکر پر عمل درآمد کرنے کے لیے آدمی نہیں تھے۔ ہم نے پرجوش تقریر اور تحریر کے ذریعہ مسلمانوں کی بھیڑ تو اکٹھا کر لی مگر جب مطلوب عمل کا وقت آیا تو معلوم ہوا کہ یہ بھیڑ اس استعداد سے خالی ہے جو پیش نظر عمل کے لیے درکار ہے۔

میرے نزدیک یہ جواب ادھورا ہے۔ مولانا مودودی کو یہ اعتراف کرنا چاہیے تھا کہ اقبال کی طرح وہ بھی اس غلط فہمی کا شکار ہوئے کہ : ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی۔ اصل یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان قانون فطرت کے تحت زوال کا شکار ہو چکے تھے۔ دوسرے لفظوں میں، وہ اپنی زرخیزی کھو چکے تھے۔ اب پہلا کام موجودہ مسلم نسلوں کی شعوری تربیت کر کے اس کو دوبارہ زرخیز بنانا تھا نہ کہ اس کو زرخیز مٹی فرض کر کے اس میں دانہ بکھیر دیا جائے۔

بدقسمتی سے موجودہ زمانہ کے تمام مصلحین کا ذہن وہی رہا ہے جس کی ترجمانی اقبال کے مذکورہ مصرعہ میں پائی جاتی ہے۔ ہر ایک نے اس مٹی کو زرخیز فرض کر لیا اور شعری یا نثری رجز خوانی کے ذریعہ اس کو جوش دلا کر بڑی بڑی بھیڑ اپنے گرد اکٹھا کر لی مگر حقیقی نتیجہ کے اعتبار سے دیکھئے تو اس کا حاصل صرف صفر نظر آئے گا۔ کیوں کہ ہری بھری فصل زرخیز زمین کو نم کرنے سے حاصل ہوتی ہے نہ کہ پتھروں کو نم کرنے سے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اس المیہ کی ذمہ داری خود مسلم رہنماؤں پر عاید ہوتی ہے نہ کہ عام مسلمانوں پر۔

بک اسٹال

واشنگٹن کی کانفرنس میں جناب خواجہ کلیم الدین صاحب اور ان کے ساتھیوں نے بک اسٹال بھی رکھا تھا۔ چند میزوں کے اوپر الرسالہ کی مطبوعات قرینہ سے رکھی گئی تھیں۔ بیشتر کتابیں لوگوں نے لے لیں۔ خاتونِ اسلام (انگریزی) کا معاملہ ہاٹ کیک جیسا ہوا۔ اس کا پورا ذخیرہ پہلے ہی دن ختم ہو گیا۔ امریکہ میں اس وقت اسلامی لٹریچر کی شدید ترین ضرورت ہے۔ مگر لٹریچر ایسا ہونا چاہیے جو باہر کے معیار کے مطابق ہو۔

معیار سے مراد یہ ہے کہ اس کا اسلوب بحث جدید علمی اسلوب کے مطابق ہو، اس کی زبان قدیم ادیبانہ طرز کی نہ ہو بلکہ جدید سائنٹفک طرز کی ہو۔ اسی کے ساتھ اس کی چھپائی اور گٹ اپ وہ ہو جو آج کے انسان کو اپنی طرف متوجہ کر سکے۔ آج کل امریکہ میں انگریزی زبان میں اسلامی کتابوں کی بھرمار ہے مگر ان میں بہت ہی کم کوئی ایسی کتاب ملے گی جو مذکورہ قسم کے مطلوب معیار پر پوری اترتی ہو۔

آزادئ فکر

ایک تعلیم یافتہ امریکی نے کہا کہ اسلام میں آزادئ رائے کا تصور نہیں۔ میرا تجربہ ہے کہ اگر کسی مسلمان کے اندر رائے کی آزادی کا تصور ہے تو وہ وہی مسلمان ہے جس کی تعلیم مغربی طرز کی یونی ورسٹی میں ہوئی ہے۔ یعنی اس کا تصور آزادی مغربی تعلیم و تربیت سے آیا ہے نہ کہ اسلام سے۔

میں نے کہا کہ میں نے ایک دن بھی کسی اسکول یا کالج یا یونی ورسٹی میں تعلیم نہیں پائی، میں مکمل طور پر دینی مدرسہ کا پروڈکٹ ہوں، اس کے باوجود میں آزادئ رائے کا زبردست حامی ہوں۔ میں نے اس موضوع پر بہت سے مضامین لکھے ہیں۔ خاص اسی موضوع پر میری ایک کتاب چھپ چکی ہے جس کا اردو نام "حریتِ فکر" ہے۔ ایسی حالت میں آپ میرے بارے میں کیا کہیں گے۔ انھوں نے کہا کہ آپ ایک استثنا ہو سکتے ہیں۔ میں نے کہا کہ ایسا نہیں۔ آزادی کے بارے میں میں نے اپنا نقطۂ نظر براہ راست قرآن و حدیث سے حاصل کیا ہے۔ میں ایک کٹر مسلمان ہوتے ہوئے آزادئ رائے کا اتنا ہی حامی ہوں جتنا کہ آپ جیسا کوئی شخص ہو سکتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اگر ایسا ہے تو مجھے اس بارے میں اسلام کے نقطۂ نظر کو پھر سے سمجھنا ہوگا۔

نیا مستقبل

ایک تعلیم یافتہ مسلمان جو علی گڑھ سے جاکر امریکہ میں آباد ہو گئے ہیں انھوں نے ہندستانی مسلمانوں

کا ذکر اس طرح کیا گویا کہ ہندستان کے مسلمان اب ختم ہو چکے ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ یہ برعکس بات کہہ رہے ہیں۔ میرے نزدیک ہندستان کے مسلمان ہر ملک سے زیادہ بہتر پوزیشن میں ہیں حتی کہ مسلم اکثریت والے ملکوں سے بھی زیادہ۔

میں نے کہا کہ ہندستان کے مسلمان کی انوکھی خصوصیت یہ ہے کہ بہت بڑی تعداد میں ہونے کے باوجود وہ اپنے آپ کو دباؤ کی حالت میں پاتے ہیں۔ یہ صورت حال ترقی کے عمل میں بے حد معاون ہے۔ تاریخ کا تجربہ ہے کہ وہی لوگ ترقی کرتے ہیں جو دباؤ سے دوچار ہوں۔ ہندستان کے مسلمانوں میں یہ عمل جاری ہو چکا ہے۔ امریکہ کے مسلمان کچھ ڈالر تو کما سکتے ہیں مگر وہ کوئی بڑی ترقی نہیں کر سکتے کیونکہ آپ لوگوں کو یہاں دباؤ والے حالات کا سامنا نہیں۔

ہندستان کے مسلمانوں میں اب یہ عمل شروع ہو چکا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہندستان میں نیوکلیر سائنس جیسے اہم شعبہ کا ڈائرکٹر ایک مسلمان ہے۔ یہ ایک علامتی واقعہ ہے جو ہندستانی مسلمانوں کے مستقبل کو بتاتا ہے۔

ہر چیز ایک سال میں

ایک مجلس میں یہ بات ہو رہی تھی کہ انڈیا اور پاکستان وغیرہ کے لوگ کیوں اپنے وطن سے بھاگ کر امریکہ آتے ہیں۔ ایک صاحب نے کہا کہ یہاں ہر چیز فوراً مل جاتی ہے۔ امریکہ آئے ہوئے مجھ کو ابھی ایک سال بھی نہیں ہوئے اور آج یہ حالت ہے کہ میرے پاس فرنشڈ مکان ہے، بڑی گاڑی ہے، موبائیل ٹیلی فون ہے وغیرہ، وغیرہ۔ اپنے وطن میں میرے لیے کبھی بھی ایک سال میں ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔

میں نے کہا کہ آپ جیسے لوگوں کو یہ چیزیں اس لیے نہیں ملتیں کہ آپ نے ایک سال کے اندر اتنا زیادہ پلیسہ کما لیا کہ آپ اس قسم کی پرعیش زندگی کی قیمت ادا کر سکیں۔ آپ جیسے لوگ یہاں آکر یہ کرتے ہیں کہ بینک سے سودی قرض لے کر فوراً ہر چیز حاصل کر لیتے ہیں اور اس کے بعد ساری زندگی سود سمیت اس کی قسطیں ادا کرتے رہتے ہیں۔ اس لائف پیٹرن کی وجہ سے آپ لوگوں کو دن رات کمانا پڑتا ہے۔ یہاں تک کہ ہر آدمی حیوان کاسب بن جاتا ہے۔

میں نے یہاں کے بہت سے لوگوں سے باتیں کیں۔ میں نے محسوس کیا کہ مادی اعتبار سے ہر آدمی بظاہر اعلیٰ زندگی حاصل کیے ہوئے ہے۔ مگر میرے تجربہ کے مطابق، لوگوں کے اندر اعلیٰ سوچ نہیں۔

اس لائف پیٹرن کی قیمت یہاں کے لوگوں کو یہ دینی پڑتی ہے کہ ان کی انٹلکچول لائف تقریباً ختم ہوجاتی ہے۔ ان کی کوئی علمی زندگی نہیں ہوتی۔ ان کا ذہن صرف کمانے کے سوال پر مرتکز ہوجاتا ہے۔ نالج کے نام سے لوگ صرف پروفیشنل نالج کو جانتے ہیں۔ کیوں کہ اپنے پروفیشن سے باہر کی چیزوں کو پڑھنے اور جاننے کے لیے ان کے پاس وقت ہی نہیں۔

میں نے کہا کہ آپ جس چیز کو ترقی بتا رہے ہیں وہ نہایت مہنگی قیمت پر ملتی ہے۔ اور اگر آپ اس قسم کی مہنگی قیمت دینے کے لیے تیار ہوں تو خود اپنے ملکوں میں بھی ایسی ہی مادی ترقی حاصل کرسکتے ہیں۔

نفرت کی قیمت

یمن کی ایک پندرہ سالہ عرب لڑکی جو امریکہ ہی میں پیدا ہوئی اور اب وہ ایک امریکی شہری ہے۔ اس سے پوچھا گیا کہ تم امریکہ کے بارے میں کیا رائے رکھتی ہو۔ اس نے کہا کہ مجھے امریکہ سے نفرت ہے۔ پھر پوچھا گیا کہ کیا تم یمن واپس جانا پسند کروگی۔ اس نے کہا کہ نہیں۔ پھر پوچھا کہ تم امریکی لہجہ میں انگریزی بولتی ہو، تمہارا لباس امریکی لباس ہے۔ امریکی گاڑی، امریکی کھانا، امریکی فرنیچر، غرض ہر چیز میں تم امریکیوں کی نقل کرتی ہو، پھر بھی تم یمنی ہونے پر فخر کرتی ہو، امریکی ہونے پر تم کو فخر نہیں۔ وہ اس کا کوئی واضح جواب نہ دے سکی۔

یہی حالت تقریباً تمام امریکی مسلمانوں کی ہے۔ اور صرف امریکہ ہی نہیں بلکہ ہر ملک کے مسلمان اسی قسم کی منفی سوچ میں مبتلا ہیں۔ ہندستان میں میری ملاقات حال میں ایک نوجوان سے ہوئی جو وہاں کے ایک اچھے اسکول میں پڑھتے ہیں۔ نوجوان سے گفتگو ہوئی تو فوراً ہی وہ ہندوؤں کو برا بھلا کہنے لگے۔ اس کا سبب کیا ہے کہ ایک مسلم بچہ یا ایک مسلم نوجوان غیر مسلموں کے بارہ میں نفرت اور شکایت کے جذبات لیے ہوئے ہے حالانکہ اس نے براہ راست طور پر اس طرح کی باتوں کا تجربہ نہیں کیا۔ اس کا ذریعہ مسلم معاشرہ ہے۔ ہمارے بچے اور نوجوان اپنے گھروں میں یا مسلم سماج میں ہمیشہ نفرت اور شکایت اور احتجاج کی باتیں سنتے ہیں۔ اس نے ان کے ذہن کو غیر مسلموں کی نسبت سے منفی بنا دیا ہے۔ اس منفی نفسیات کا سب سے بڑا نقصان خود مسلمانوں کے حصہ میں آیا ہے۔ غیر مسلم مسلمانوں کے لیے مدعو کی حیثیت رکھتے تھے، ان کو اسلام کا پیغام پہنچانا تھا جو مسلمانوں کے لیے سب سے بڑی عبادت ہے۔ مگر وہ اس سب سے بڑی عبادت کے ثواب سے محروم ہیں۔ دعوت ایک خیر خواہی کا عمل ہے اور نفرت کے ساتھ کبھی خیر خواہانہ عمل جمع نہیں ہوتا۔

غلط فہمی

مسٹر نور محمد لودیا نیویارک میں رہتے ہیں۔ وہ ایک تاجر ہیں۔ وہ عرصہ سے الرسالہ مطبوعات کا مطالعہ کرتے رہے ہیں۔ ان کے متعلق معلوم ہوا کہ آج کل ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے میں ان کی عیادت کے لیے ان کی رہائش گاہ پر گیا۔ معلوم ہوا کہ موجودہ علاج سے ان کو کافی فائدہ ہے۔ ان شاء اللہ جلد ہی ان کی صحت معمول پر آجائے گی۔ ان سے ملاقات کے وقت جناب حبیب محمد صاحب اور جناب فاروق چشتی صاحب بھی موجود تھے۔

گفتگو کے دوران جناب نور محمد لودیا صاحب نے کہا کہ میں برابر الرسالہ پڑھتا ہوں۔ آپ کی کتابوں کا بھی مطالعہ کر چکا ہوں۔ مجھے آپ کے نقطۂ نظر سے پورا اتفاق ہے۔ میں جانتا ہوں کہ بہت سے لوگ آپ کی مخالفت کر رہے ہیں مگر اس مخالفت کا سبب صرف غلط فہمی ہے۔ لوگ ہمیشہ باتوں کو حال کے خانہ میں دیکھتے ہیں، جب کہ آپ مستقبل کو سامنے رکھ کر بول رہے ہیں۔ یہ ایک انٹلکچول گیپ (intellectual gap) کا معاملہ ہے۔ بیسویں صدی میں خواہ آپ کی باتیں لوگوں کی سمجھ میں نہ آئیں مگر اکیسویں صدی کے لوگ آپ کی باتوں کو خوب سمجھیں گے۔ اس وقت لوگوں پر کھل جائے گا کہ آپ کی رہنمائی کتنی زیادہ درست تھی۔

مسٹر نور محمد لودیا خاموشی کے ساتھ ایک بہت بڑا کام کر رہے ہیں۔ انھوں نے الرسالہ مشن کی بعض بنیادی کتابوں کو بڑی تعداد میں چھپوا کر مختلف ملکوں میں مفت تقسیم کرایا ہے۔ مزید یہ کہ یہ تقسیم کرانا اس طرح نہیں ہے کہ ایک آدمی جمعہ کے دن مسجد کے دروازہ پر کھڑا ہو گیا اور ہر آنے جانے والے کے ہاتھ میں ایک کتاب دے دی۔ اس کے بجائے تقسیم کا یہ کام انھوں نے ایک منظم انداز کے تحت انجام دیا ہے۔ انھوں نے مختلف ملکوں کے اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کی فہرست تیار کرائی۔ اداروں اور لائبریریوں کے پتے حاصل کیے اور پھر دستی طور پر یا ڈاک کے ذریعہ انھیں پہنچانے کا انتظام کیا۔ اس طرح یہ ہوا کہ تھوڑی مدت میں بہت وسیع پیمانہ پر اہل فکر حضرات تک الرسالہ کا پیغام پہنچ گیا۔

غیر قوم

ایک باریش مذہبی مسلمان سے ملاقات ہوئی۔ وہ ہندستان میں پیدا ہوئے اور اب یہاں آکر رہ رہے ہیں۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ پہلے بھی میں غیر قوم کے درمیان رہ رہا تھا۔ اور اب یہاں

بھی غیر قوم کے درمیان رہتا ہوں۔ یہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی عام نفسیات ہے۔ وہ دنیا کو اپنی قوم اور غیر قوم میں بانٹے ہوئے ہیں۔ اس انسانی تقسیم کا نقصان اتنا زیادہ ہے کہ اس کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اسی تقسیم کا یہ نتیجہ ہے کہ اب وسیع تر انسانیت مسلمانوں کا کنسرن (concern) نہیں رہی۔ ان کی ساری دل چسپیاں اپنی قوم کے لیے ہیں نہ کہ انسانیت کے لیے۔ وہ ہر معاملہ میں اپنی قوم کی وکالت کرتے ہیں اور دوسری قوم کی مخالفت۔

اس صورت حال کا پہلا نقصان یہ ہوا ہے کہ مسلمانوں کے درمیان مثبت انداز پر فکری ارتقاء نہ ہو سکا۔ ان کے لکھنے اور بولنے والوں میں آفاقی طرز فکر تقریباً معدوم نظر آتا ہے۔ ان کے فکری ڈھانچہ میں ان کا اپنا مقام امامتِ عالم کا ہے، اور دوسری قوموں کا مقام صرف یہ کہ وہ ان کی امامت کو قبول کر کے ان کے مقابلہ میں کم تر حیثیت پر راضی ہو جائیں۔ اس مزاج کا نقصان یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان دعوتی اسپرٹ سے محروم ہو گئے۔ جو کہ مسلمان کی اصل امتیازی صفت ہے۔ دعوت کا مطلب دوسروں کی خیر خواہی ہے۔ دعوت کا جذبہ ہمیشہ اس سینہ میں ابلتا ہے جو دوسروں کی محبت سے بھرا ہوا ہو۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان برعکس طور پر دوسروں کے حق میں نفرت و شکایت کے جذبات لیے ہوئے ہیں۔ ایسی حالت میں یہ ناممکن ہے کہ دعوت کا آبشار ان کے سینہ سے پھوٹ کر نکلے۔

اسی منفی نفسیات کا یہ نقصان بھی ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان مادی اعتبار سے دوسری قوموں سے پچھڑ گئے ہیں۔ اس لیے کہ مادی ترقی ہمیشہ اس وقت ہوتی ہے جب کہ ایک قوم اور دوسری قوم کے درمیان معتدل انداز میں اختلاط (interaction) ہو رہا ہو۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان اپنی مذکورہ نفسیات کی بنا پر دوسری قوموں سے قریب ہونے کے بجائے دور ہو گئے، وہ ان سے گھلنے ملنے کے بجائے اپنا علاحدہ گروہی تشخص قائم کرنے کو اسلام سمجھنے لگے۔ اس طرح کے غیر فطری اور غیر معتدل ماحول میں کبھی ترقیاتی سرگرمی جاری نہیں ہو سکتی، اور نہ وہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں جاری ہوئی۔

عجیب تجربہ

امریکہ کے اس سفر میں ایک عجیب تجربہ ہوا۔ ہندستان کے کچھ سطحی دانشور یہاں کے مسلمانوں میں میرے خلاف جو پروپیگنڈا کر رہے ہیں وہ بے بنیاد پروپیگنڈا امریکہ تک بھی پہنچ چکا ہے۔ یعنی یہ کہ میں ہندو انتہا پسند جماعتوں (بالفاظ دیگر مسلم دشمن جماعتوں) کا آدمی ہوں اور ان کی حمایت میں سرگرم ہوں۔

وہ لوگ بھی کیسے عجیب ہیں جو جھوٹی خبر کو پھیلائیں اور سچی خبر کو چھپائے رکھیں۔ اس معاملہ میں سچی خبر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میرے ذریعہ سے ہندستان میں ایک آگ کو بجھا دیا۔ میرے مشن کو اللہ تعالیٰ نے ہندستانی مسلمانوں کے لیے رحمت بنا دیا۔

پچاس سال سے بھی زیادہ مدت سے ہندستان کے تمام مسلم رہنما یہ کہتے آرہے تھے کہ اس ملک کا نمبر ایک مسئلہ یہ ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں تناؤ کو ختم کیا جائے اور دونوں فرقوں کے درمیان معتدل تعلقات قائم کیے جائیں۔ یہ تمام رہنما اس معاملہ کا حل یہ بتا رہے تھے کہ سیکولر ہندوؤں سے تعلقات بڑھائیں اور سیکولر طاقتوں کو مضبوط کر کے مسلم مخالف فرقہ واریت کا مقابلہ کریں۔ یہ تدبیر بہت بڑے پیمانہ پر عمل میں لائی گئی مگر وہ مکمل طور پر ناکام رہی۔

اللہ کی توفیق سے مجھ پر یہ بات کھلی کہ ہمارے رہنما "نو پرابلم ہندو" سے تعلق بڑھانے کو مسئلہ کا حل سمجھے ہوئے ہیں۔ حالانکہ حقیقی حل یہ ہے کہ پرابلم ہندو سے تعلق بڑھایا جائے اور ان کے مخالفانہ جذبات کو ٹھنڈا کیا جائے۔

اس مقصد کی خاطر میں نے پرابلم ہندوؤں سے تعلقات بڑھانے کے لیے بہت بڑے پیمانہ پر ان کے درمیان جانا، اور ان کے اخباروں میں کثرت سے مضامین شائع کرنا شروع کیا۔ ان کے جلسوں کو مسلسل طور پر خطاب کیا۔ ان کے پروگراموں میں شرکت کی۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی مدد سے ۱۹۴۷ کے بعد پہلی بار یہ واقعہ پیش آیا کہ پرابلم ہندو بھی نو پرابلم ہندو کی طرح ہو گئے۔ اس کے لیے مجھے جو قربانی دینی پڑی اس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔

گویا کہ مسئلہ تو پرابلم ہندوؤں نے پیدا کیا تھا۔ مگر مسلم رہنما اس کو نو پرابلم ہندوؤں کی سطح پر حل کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ ایسا طریقہ اسباب کی اس دنیا میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا تھا، اس لیے وہ کامیاب بھی نہیں ہوا۔

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے فرقہ وارانہ کشیدگی کو ختم کرنے کے لیے میں نے جو کوشش کی اس کے انقلابی نتائج برآمد ہوئے ——— "مسجد توڑو مندر بناؤ تحریک" اپنے پہلے ہی مرحلہ میں ختم ہو گئی۔ اس تحریک پر ہمیشہ کے لیے اجودھیا میں فل اسٹاپ لگ گیا، جب کہ تمام لوگ اس کو کامیاب سمجھے ہوئے تھے۔ ہندستان سے فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ تقریباً ختم ہو گیا۔ یکساں سول کوڈ کی تحریک کا

زور ٹوٹ گیا۔ کشمیر کی متشددانہ تحریک ٹھنڈی پڑ گئی، جو ہندستانی مسلمانوں کے لیے بالواسطہ طور پر سنگین مسئلہ بنی ہوئی تھی۔ بڑے بڑے اینٹی مسلم لیڈروں نے کھلے طور پر اعلان کیا کہ ہم مسلم دشمن نہیں ہیں، وغیرہ۔

اس طرح ہندستان میں جو پر امن ماحول قائم ہوا اس کا مثبت نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان عمومی پیمانہ پر تعلیم کے میدان میں سرگرم ہو گئے۔ وہ بڑی بڑی تجارتیں کرنے لگے۔ زندگی کی تعمیر کے میدان میں وسیع پیمانہ پر ان کی سرگرمیاں شروع ہو گئیں۔ ترقیاتی کاموں کے دروازے ان پر کھل گئے۔ یہ سب کا سب فرقہ وارانہ تناؤ کے خاتمہ کا نتیجہ تھا۔

۱۹۴۷ کے بعد جتنے لکھنے اور بولنے والے مسلمان اٹھے سب کے سب صرف شکایت اور مطالبہ کی تحریک چلاتے تھے۔ اس زمانہ میں مسلم سیاست کا مطلب صرف احتجاجی سیاست تھا۔ فطرت کے قانون کے مطابق یہ ساری کوششیں بالکل بے نتیجہ ہو گئیں۔ الرسالہ مشن نے پہلی بار یہ کیا کہ مسلمانوں کو خود تعمیری کا سبق دیا۔ یہ بتایا کہ ہندستان میں بھی ان کے لیے وہ تمام امکانات موجود ہیں جو دوسرے ملکوں میں پائے جاتے ہیں۔ ہندستان ان کے لیے مسائل کا ملک نہیں بلکہ مواقع کا ملک ہے۔ اس طرح الرسالہ مشن نے پہلی بار مسلمانوں کو بے اعتمادی کی فضا سے نکال کر اعتماد کی فضا میں داخل کیا۔ ان کو پہلی بار اس ملک میں خود اعتمادی کی دولت حاصل ہوئی، اور بلاشبہ خود اعتمادی تمام اچھی چیزوں میں سب سے اچھی چیز ہے۔

آغاز کی تکمیل

امریکہ کے زمانہ قیام میں کچھ ایسے مسلمانوں سے ملاقات ہوئی جو مغربی تہذیب کو تاریخ کی سب سے بڑی برائی بتاتے تھے اور اس کے خلاف بے تکان تقریر کرتے تھے۔ ایک مجلس میں میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ کے مسلم رہنما عام طور پر یہی کہتے ہیں۔ وہ مغربی تہذیب کو ایک باطل تہذیب یا مسلم دشمن تہذیب کے روپ میں دیکھتے ہیں مگر یہ صرف سطحی مطالعہ کا نتیجہ ہے۔

یہ صحیح ہے کہ مغربی تہذیب میں کچھ واضح برائیاں ہیں۔ مثلاً شراب، مگر اس قسم کی بعض خرابی ہر تہذیب میں پائی جاتی ہے۔ کسی تہذیب کی قدر و قیمت متعین کرنے کے لیے اس کو مجموعی اعتبار سے دیکھنا چاہیے نہ کہ محدود اعتبار سے۔

میں نے اس معاملہ کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ میرے نزدیک جدید مغربی تہذیب خود اسلامی تہذیب

ہی کے نتائج میں سے ایک نتیجہ ہے۔ انسانی زندگی میں بڑی بڑی تبدیلیاں ہمیشہ تدریجی طور پر سیکڑوں سال کے عمل کے نتیجہ ہی میں پیش آتی ہیں۔ دور اول میں جو اسلامی انقلاب آیا اس کا ایک عظیم کارنامہ یہ ہے کہ اس نے انسانی تاریخ میں پہلی بار بہت سی اعلیٰ انسانی قدروں کا آغاز کیا۔ یہ تبدیلی تاریخی پراسس کے طور پر مسلسل جاری رہی یہاں تک کہ وہ مغربی تہذیب کی صورت میں اپنے عروج پر پہنچی۔ مثلاً مذہبی آزادی، جمہوری سیاست، غلامی کا خاتمہ، فطرت کی تسخیر، بین اقوامی انسانی تعلقات، انسانی مساوات، قانونی حکمرانی، وغیرہ اسلام کے اولیات میں داخل ہیں۔ ان تمام چیزوں کا آغاز اسلام نے کیا اور پھر تاریخی عمل سے گزر کر وہ اپنے موجودہ تکمیلی مرحلے تک پہنچا۔

مغربی تہذیب کے ساتھ ہمارا معاملہ نفرت اور عداوت کا نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس حدیث کے تحت ہونا چاہیے کہ: الحکمۃ ضالۃ المؤمن این وجدھا فھو احق بھا۔

انسانی رعایت

امریکہ کے سفر کے لیے میں ۴ فروری ۱۹۹۸ کی رات کو سوئس ایر کے ذریعہ روانہ ہوا۔ واپسی ۱۷ فروری ۱۹۹۸ کو ہوئی۔ ہجری کیلنڈر کے لحاظ سے اب میں اپنی عمر کے ۸۷ سال میں ہوں۔ اس اعتبار سے اب مجھے سفر میں مددگار کی ضرورت ہوتی ہے۔ دہلی سے جاتے ہوئے جناب حبیب محمد صاحب کا ساتھ تھا ان کی وجہ سے سفر میں کافی مدد ملی، مگر واپسی میں مجھے تنہا آنا پڑا۔

۱۶ فروری کو جب میں واشنگٹن ایرپورٹ واپسی کی فلائٹ لینے کے لیے پہنچا تو میں سخت متردد تھا۔ خاص طور پر یہ کہ زیورک (سوئزرلینڈ) میں جہاز بدلنا ہوگا۔ زیورک کا ایرپورٹ بہت بڑا ہے۔ میں گھبرایا ہوا تھا کہ زیورک کے مراحل کس طرح طے ہوں گے۔ مگر عملاً یہ میری زندگی کا آسان ترین سفر بن گیا۔

خواجہ کلیم الدین صاحب نیویارک میں رہتے ہیں۔ وہ مجھے پہنچانے کے لیے واشنگٹن ایرپورٹ پر آئے تھے۔ انھوں نے یہ کیا کہ ایرپورٹ پر میرا بورڈنگ کارڈ لیتے ہوئے یہ لکھوا دیا کہ میں ایک سینیر سٹی زن ہوں (یہ لوگ بوڑھے آدمی کے لیے سینیر سٹی زن کا لفظ استعمال کرتے ہیں) اس کے بعد میں ایرلائن کا خصوصی مہمان بن گیا۔ میں ابھی جہاز کے اندر ہی تھا کہ ایرپورٹ کے عملہ کی طرف سے مجھے بتایا گیا کہ آپ مطمئن رہیں زیورک ایرپورٹ پر ہم نے پیغام بھیج دیا ہے اور وہاں آپ کی مدد کے لیے ہمارے آدمی موجود ہوں گے۔

جہاز اپنے وقت پر زیورک ایرپورٹ پر اترا۔ میں جہاز کے دروازہ سے نکل کر باہر آیا تو وہاں بیٹری سے چلنے والی ایک خوب صورت گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ ایک خاتون نے میرا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ آپ اس پر بیٹھ جائیں۔ اس کے بعد وہ گاڑی مجھے لے کر روانہ ہوئی، کچھ دور چل کر ایک بڑی لفٹ کا دروازہ کھلا، اس لفٹ نے مجھے گاڑی سمیت اوپر کی منزل پر پہنچا دیا۔ یہاں ہال کی مانند ایک وسیع کمرہ میں مجھے داخل کیا گیا۔ اس کمرہ میں ہر قسم کی سہولت کا سامان موجود تھا۔ اس کے وسیع دیواری شیشہ کے باہر فطرت کا خوب صورت منظر مزید اضافہ کے ساتھ برائے مشاہدہ موجود تھا۔

یہاں کئی گھنٹے تک میں نہایت سکون کے ساتھ آرام دہ گدے پر سوتا رہا۔ جب اگلے جہاز کا وقت قریب آیا تو دوبارہ ایرپورٹ کی ایک خاتون آئیں اور مجھ کو لے جاکر جہاز کے اندر بٹھا دیا۔ جہاز جب دہلی ایرپورٹ پر اترا تو دوبارہ ایک ایرہاسٹس آئی۔ اس نے کہا کہ آپ اپنی سیٹ پر بیٹھے رہیں، ہم یہاں بھی آپ کے لیے انتظام کر رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ دہلی میرا وطن ہے۔ یہاں ان شاء اللہ میں خود اس کو مینج کر لوں گا۔ آپ کا شکریہ۔

دہلی میں جب میں اپنے گھر پہنچا تو گھر والوں نے کہا کہ آپ تو اس طرح تازہ دم معلوم ہو رہے ہیں جیسے کہ آپ امریکہ سے نہیں آرہے ہیں بلکہ قریب کے محلہ سے آرہے ہیں۔ میں نے انھیں بتایا کہ یہ ایک پراسرار لفظ کی کرامت تھی۔ یہ لفظ ہے —— سینیر سٹی زن۔

معذوروں کی مدد کرنا ہر زمانہ میں پایا جاتا رہا ہے۔ مگر قدیم زمانہ میں اس کی حیثیت زیادہ تر ایک انفرادی اخلاقی صفت کی ہوتی تھی۔ جدید تہذیب نے اس میں یہ اضافہ کیا کہ اس کو ایک باقاعدہ انسٹی ٹیوشن یا سماجی تصور کی حیثیت دے دی۔ جن لوگوں نے مغرب کے ترقی یافتہ ملکوں کا سفر کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ ان ملکوں میں بوڑھے اور معذور لوگ "وی، آئی، پی" کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے لیے ہر جگہ خصوصی اہتمام کیا جاتا ہے۔ اسی کی ایک مثال وہ تھی جو میرے ساتھ زیورک ایرپورٹ پر پیش آئی۔

① L. Island Exp - Exit #27
Til Jamaica - Hempstead
② 1st left turn - C-town R/T
③ Next 93rd Rd — R/T
226-27 93rd Rd

Size 22×14.5cm,
88 pages

Size 22×14.5cm,
200 pages

Size 22×14.5cm,
288 pages

Size 22×14.5cm,
116 pages

Size 22×14.5cm,
96 pages

Size 22×14.5cm,
292 pages

Size 22×14.5cm,
208 pages

Size 22×14.5cm,
264 pages

Size 22×14.5cm,
176 pages

Size 22×14.5cm,
24 pages

Size 22×14.5cm,
144 pages

Size 22×14.5cm,
160 pages

AL-RISALA BOOK CENTRE
1, Nizamuddin West Market, Near DESU, New Delhi-110 013
Tel. 4611128, 4611131 Fax 91-11-4697333

Finest collection of books on Islam

AL-RISALA BOOK CENTRE

1, Nizamuddin West Market, Near DVB, New Delhi-110 013
Tel. 4611128, 4611131, Fax 4697333
e-mail: risala.islamic@axcess.net.in, Web: http://www.alrisala.org

RNI 28822/76 • U(SE) 12/9
Delhi Postal Regd. No. DL/11154/98